آخری تعاقب
(افسانوی مجموعہ)
مرتضیٰ ساحل تسلیمی

کتاب کا نام : آخری تعاقب
مصنف : مرتضیٰ ساحل تسلیمی
ترتیب : عبدالباری وسیم
کمپوزنگ : سید شریف میاں و مدثر علی خاں
طباعت : نیو پرنٹ سینٹر، نئی دہلی۔2
ناشر : مرتضیٰ ساحل تسلیمی۔ محلہ شتر خانہ، رامپور (یو۔پی)
رابطہ نمبر : 09897645925
اشاعت : نومبر 2015ء
صفحات : 160 تعداد اشاعت : 500
:

ISBN : 97-93-85295-09-6

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

تقسیم کار : ❁ الحسنات بک ورلڈ پبلشرز
پرانی گھنڈ سار، رامپور (یو۔پی) فون: 09997344420
❁ الحسنات بکس پرائیویٹ لمیٹڈ۔
سرسید روڈ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲ فون: 011-23271845
❁ جنت بکڈپو۔ بازار نصراللہ خاں، رامپور (یو۔پی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب:

اپنی والدۂ محترمہ مقصودی بیگمؒ

کے نام

جن کی تربیت میں بہشتی زیور کے ساتھ ہی

علامہ راشد الخیریؒ

اور

ڈپٹی نذیر احمدؒ

کے اصلاحی و تربیتی قصوں، افسانوں اور ناولوں کے مطالعہ نے

انھیں ایک مثالی عورت بنایا تھا

فہرست

⚙ ⚙ ⚙

مرتضیٰ ساحل تسلیمی - ایک ہمہ جہت قلمکار

مرتضیٰ ساحل تسلیمی تقریباً چار دہائیوں سے تخلیقات کی دنیا میں بے تکان محوِ سفر ہیں۔ نظم ہو کہ نثر ان کو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کا پہلا قطعہ ۱۹۷۰ء میں روزنامہ ناظم رام پور، پہلی کہانی ماہنامہ نور، رام پور اور پہلا افسانہ ۱۹۷۴ء میں حیدرآباد سے شائع ہونے والے ایک فلمی و ادبی میگزین کی زینت بنے۔ بچّوں کے نثری و منظوم کارناموں کی بدولت ان کی شخصیت بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ جہاں وہ بچوں کے ادیب و شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں وہیں ان کے فن کی بوقلمونی کو مضمون نگاری، انشائیہ نگاری، اداریہ نویسی، تبصرہ نگاری، مزاح نگاری وغیرہ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے نثری و منظوم شہ پارے ملک اور بیرونی ممالک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ بچّوں کے لیے تقریباً ۳۶ نثری و شعری مطبوعات کے علاوہ خواتین کے لیے گھر گھر کی کہانی، ملّی مسائل سے متعلق ملی مسائل میں مساجد کا کردار نہایت اہم ہیں۔ ان کی ایک گراں قدر تصنیف مولانا محمد عبدالحیٔ حیات و خدمات کو مکتبہ الحسنات، دہلی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کر کے بلا شبہ ایک قابلِ قدر اور یادگار کارنامہ انجام دیا ہے۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف انجمنوں اور اداروں نے انعامات

واعزازات سے بھی نوازا ہے۔

بچّوں کے ادب میں مرتضٰی ساحل تسلیمی کے مقام ومرتبہ کے تعیّن اور کارناموں کونمایاں کرنے کی غرض سے محمد مسلم غازی کا مرتب کردہ مضامین وتاثرات کا مجموعہ ''بچّوں کا ادب اور مرتضٰی ساحل'' نہایت اہمیت کا حامل ہے جسے سیّد پبلشنگ کمپنی، کناٹ پلیس، نئی دہلی نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا تھا۔اس مجموعہ میں شامل پروفیسر آلِ احمد سرور، قاضی عبدالستار، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ظفر پیامی، کیف بھوپالی، ڈاکٹر ابنِ فرید، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، اکبرعلی خاں عرشی زادہ، رئیس رام پوری، ہوش نعمانی جیسے معتبر متعدد ادبا، شعرا، اور نقّادانِ فن کے مضامین وتاثرات سے مرتضٰی ساحل تسلیمی کی نہ صرف گراں قدر ادبی خدمات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ یہ مجموعہ بچّوں کے ادب پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے بھی بلاشبہ مددگار ومعاون ثابت ہوگا۔

جنابِ مرتضٰی ساحل تسلیمی نے 'حرارت' کے ساتھ افسانوی دنیا میں قدم رکھا یعنی ان کے پہلے افسانہ کا نام حرارت ہے اور یہ حرارت نہ صرف تادمِ تحریر برقرار روباقی ہے بلکہ عمر کے ساتھ روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ وہ انسانی ذہنوں اور سماجی رشتوں کی ٹوٹتی بکھرتی کیفیات اور اس کے کھر دُرے پن کے بظاہر معمولی مگر نہایت اہم واقعات وحادثات کے ذریعہ اپنے افسانوں میں قوت وحرارت پیدا کرنے کے ہُنر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے زندگی اور اُسکے حقائق ومسائل کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات، کربِ ذات، انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں مرتضٰی ساحل تسلیمی کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کے افسانوں اور منی کہانیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ کو نہ صرف بڑی شدّت سے محسوس ہی کیا ہے بلکہ خود کو تجربہ کی آنچ میں تپایا بھی ہے۔ محسوسات کی یہی شدّت اور تجربات کی یہی آنچ افسانہ نگار کے تخلیقی عمل کو افسانوں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے مجبور کردیتی ہے۔ اُنھیں قصہ گوئی کے فن پر مہارت حاصل ہے۔ قصہ گوئی، کردار نگاری، پلاٹ سازی اور اسلوب کی دل کشی سے ان کے فن کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے افسانوں اور منی کہانیوں میں طنز کے ایسے

نشتر پنہاں ہوتے ہیں کہ قاری اُف کیے بغیر غور وفکر کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اس ہُنر سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ایک منجھے ہوئے فن کار کو کیا قلم بند کرنا ہے اور کیا نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے حالتِ حاضر کے مسائل کے علاوہ اصلاحی، تربیتی، اور اخلاقی پہلوؤں کے عکّاس ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ سماج میں ایک خوش گوار تبدیلی کے لیے افسانہ نگار کس قدر بے چین و بے تاب ہے جو بلاشبہ صحت مند ادب کا خاصہ ہے۔ ایسے افسانوں میں رِشتے، مجھے معاف کردو، امن کا پیامبر، تیسری بیوی اور آخری تعاقب کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر شریف احمد قریشی
(ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، ڈی۔لٹ)
پھوٹا محل۔ گیان مندر روڈ
رام پور (یو۔پی)
رابطہ : 09027257007

مرتضٰی ساحل تسلیمی

ادب برائے زندگی کا قائل افسانہ نگار

ادب میں جدید عصری حسیت کو فروغ دینا ضروری ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی اور اخلاقی قدروں کی پاسداری کریں۔ ادیب کو سماج کا ایک فرد ہونے کے ناطے اپنے معاشرے کی اصلاح کا بھی فرض انجام دینا چاہیے۔ آج ہمارا معاشرہ جس پراگندگی اور اخلاقی زوال کا شکار ہے اس کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ہم ایسا ادب تخلیق کریں جس کے مطالعے سے لوگوں کی تربیت ہو سکے۔ بامقصد اور صحیح رجحان پیدا کرنے والا ادب۔ اگر ادبی شہ پارہ دلچسپی کی شرائط بھی پوری کرتا ہے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ اس میں سائنس اور دیگر معلوماتی باتیں بھی شامل ہوں تو اور ابھی اچھا ہے۔ مرتضٰی ساحل تسلیمی اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

شاعر کو مشاعروں کے ذریعہ کافی داد مل جاتی ہے لیکن نثر نگار اس سے محروم رہ جاتا ہے، اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے نثری ادب کو فروغ دے کر ادیبوں خصوصاً افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

مرتضٰی ساحل تسلیمی انجمن آرائی بالکل پسند نہیں کرتے، وہ انفرادی طور پر کام کرنا زیادہ

بہتر سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ذاتی طور پر لکھتے رہو اور چھپتے رہو۔ ایک دن دُنیا خود ہی تسلیم کرلے گی۔ اُنہوں نے ادبی دنیا کے ہنگاموں سے دور رہ کر بھی اپنا الگ مقام بنالیا ہے۔ مرتضٰی ساحل تسلیمی نے ہمیشہ مسکراہٹوں کے چراغ جلائے۔ نہایت انکساری اور وضع داری سے دوستی نبھاتے رہتے ہیں۔ ان خوبیوں کے بارے میں وہ فرماتے ہیں: ''میری ذہنی تربیت میں ابا جان (مولانا عبدالحی مرحوم) کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اُن سے ملاقات سے پہلے کی تخلیقات کو میں عہد جہالت کی خرافات قرار دیتا ہوں اور اُنھیں میں نے ضائع کر دیا ہے۔'' (بحوالہ عتیق جیلانی سالک کے مضمون، بچوں کا شعری ادب اور مرتضٰی ساحل تسلیمی)۔

ادار یہ نویسی، افسانہ نگاری، انشائیہ نویسی جیسے اصناف میں مرتضٰی ساحل تسلیمی کا ایک نمایاں نام ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے بے شمار افسانے لکھ کر ملک گیر سطح پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ سال ۲۰۱۴ء کے لئے اُتر پردیش حکومت نے ایوارڈ برائے ادبِ اطفال عطا کیا ہے۔ آپ کی اب تک تقریباً ۴۳ کتب منظر عام پر آ چکی ہیں اور مزید اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔

ان کے افسانے، مضامین اور اداریے موضوع کے اعتبار سے اردو میں نئے امکانات اور زندگی کی نئی تعبیرات کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ کردار نگاری، پلاٹ سازی اور اسلوب کی دلکشی سے مرتضٰی ساحل تسلیمی کے فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ بیشتر افسانے اصلاحی، تربیتی اور اخلاقی پہلوؤں کے عکاس ہیں اور یہ اُن کی تحریر کا خاصہ ہے۔ مثبت اور منفی قدروں کی کشمکش میں اُن کا قلم رواں دواں رہتا ہے۔ نثری مطبوعات میں ناول، گھر گھر کی کہانی، کڑوی سچائیاں، نصیحتوں کے چراغ قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں زندگی کی عکاسی کرنے والے افسانہ نگاروں کی تعداد بہت ہے، مگر مرتضٰی ساحل تسلیمی نے اپنے افسانوں کے لیے قرب و جوار میں اور روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے حالات کو موضوع بنایا جس کا مقصد معاشرے کی اصلاح رہا ہے۔

ادب سماج کا مکمل آئینہ ہے، اس حقیقت سے مرتضٰی ساحل تسلیمی بخوبی واقف ہیں۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں، اُنہوں نے مشاہدات اور تجربات کو اپنے افسانوں کا وسیلہ

بنایا ہے۔ وہ خیالی اور رومانی دُنیا کی سیر کرانے سے یکسر احتراز کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں اِردگرد کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اُن کے ساتھ زندگی کے لیل ونہار گزارتے ہیں، وہ اُن کے بود و باش، گفت وشنید اور اُن کے مشاغل سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

مرتضیٰ ساحل تسلیمی اُردو ادب میں یوں تو بچّوں کے معروف ادیب مانے جاتے ہیں۔ اُن کی ادبی زندگی کا آغاز بچّوں کی نظم سے ہوا لیکن زبان کا مزہ بدلنے کے لیے اُنہوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی بھی کی۔ اُن کے فن کو طنز ومزاح نگاری میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جو بھی انشایئے اُنہوں نے لکھے ملک کے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ فنِ انشائیہ کی نزاکتوں، لطافتوں سے خود بھی آشنا ہوئے اور قاری کو بھی آشنا کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی ان کی تخلیقات نشر ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح مرتضیٰ ساحل تسلیمی موجودہ دور کے معروف ادیب شمار کیے جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے، ان کے افسانوں کا مجموعہ ''آخری تعاقب'' پسند کیا جائے گا۔

پرویز اشرفی
ڈی-۳۲۱، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
رابطہ : 9990129128

❁ ❁ ❁

پیش لفظ

یہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے اور شاید آ.....نہیں، ابھی اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں میں ریڈیو اور رسائل کے لئے متعدد افسانے تحریر کیے۔ محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک سو تو ہو ہی سکتی ہے۔ مگر کسی فائل اور کسی ڈائری میں ریکارڈ نہ رکھنے کی خراب عادت کی وجہ سے میرے سامنے چند افسانے ہی تھے۔ جو پریشانی سابقہ کتب کی تیاری کے وقت آتی رہی تھی، وہی پھر دامن گیر تھی۔ حسبِ عادت رسالوں میں تلاش کیے۔ مگر رسالے تو ہیں ہی ایسی چیز جو میز پر آنے کے بعد مطالعہ کی شوقین ہمسایہ اور محلے کی خواتین نیز دیگر احباب کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ عموماً کبھی واپس نہ آنے کے لیے، اور جو آ جاتے ہیں ان کی حالت اس قدر خراب ہوتی ہے انہیں تا دیر رکھنا بھی کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ بہر حال تلاش بسیار کے بعد اتنے افسانے ضرور مل گیے کہ ایک کتاب شائع ہو سکے۔ اِن ہی افسانوں پر مشتمل ''آخری تعاقب'' آپ کے پیشِ نظر ہے۔

میں یہاں یہ وضاحت کردوں کہ میں اُس مدرسہ ادب کا ادنیٰ طالب علم ہوں جس کا نصاب ''ادب برائے زندگی'' کے اصول وضابطے پر تیار کیا گیا ہے۔ ادبِ اطفال ہو کہ ادب بالغان، نظم وغزل ہو کہ کہانی وافسانہ۔ یہاں سے ''با مقصد ادب'' کی سند حاصل ہوتی ہے۔ یہاں سے فارغ ادیب اعلیٰ انسانی قدروں کی ترویج واشاعت کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ تعمیری

اور اصلاحی ادب پاروں سے معاشرہ کو پاکیزہ اور پُر وقار بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ میرے افسانوں کا مقصدِ تخلیق بھی یہی ہے۔

آپ میرے اس احساس کی تردید یقیناً نہیں کر سکیں گے کہ کسی بھی انسان پر ماحول کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ اچھے بھلے مرد کو اگر کچھ عرصے تک خواتین کے ہی درمیان رہنے کا موقع مل جائے اُس کے لہجے میں بھی نسوانیت سرایت کر جائے گی اور اس کی گفتگو میں کم از کم ''اوئی اللہ'' اور ''اللہ نصیب اچھا کرے'' جیسے نسوانی فقرے غیر محسوس طور پر شامل جائیں گے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

میں خواتین کے ڈائجسٹ ماہنامہ ''بتول'' کی ادارت میں پہلے شمارے سے شریک رہا ہوں۔ چنانچہ کثرت سے خواتین کے خطوط قلمکار بہنوں کے افسانے اور ''آپ کی الجھنیں آپ کے مسائل'' کے تحت معاشرتی بے ضابطگیاں مطالعے میں رہیں۔ لہٰذا میں نے جب جب افسانہ لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا وہی سارے مسائل صف باندھے کھڑے نظر آئے۔ مثلاً رشتوں کی کمیابی، بیوی کے لیے انتخاب کا معیار، جہیز کی غیر اسلامی رسم، لڑکے والوں کے مطالبات اور پُر تکلف ضیافتیں وغیرہ۔ یہ اور ان کے علاوہ جن مسائل نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا اُن میں لڑکیوں کے سرپرستوں کی بے جا ضد، حد سے بڑھی ہوئی انانیت، اعلیٰ ذات کے ہونے کا فخر، عمر رسیدہ لڑکیوں میں احساسِ کمتری اور منفی سوچوں کا پیدا ہونا اور کبھی کبھی خود کشی جیسے حرام فعل کو اختیار کر لینا قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ میری افسانہ نگاری بھی ان مسائل کے حصار سے گاہے بہ گاہے باہر نکل سکی۔ اس لیے ''آخری تعاقب'' کے کئی افسانوں میں ان ہی مسائل کی ترجمانی ملے گی۔ میں یہ جانتا ہوں کہ افسانہ افسانہ ہوتا ہے اور کہانی کہانی۔ یہ وعظ نہیں ہو سکتے۔ میں نے ابھی انہیں افسانہ ہی رہنے دیا ہے البتہ اس مقصد کے حصول سے بھی غفلت نہیں برتی جس کا ذکر میں نے اس پیش لفظ کے درمیان میں کیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے محرک میں اپنے دو کرم فرما، معروف افسانہ نگار برادرم پرویز اشرفی اور بچوں کے اُبھرتے ہوئے ادیب عزیزم محمد سراج عظیم کو مانتا ہوں جن کی دلچسپی

اور بار بار کے اصرار نے مجھ سے یہ کام کرایا، ورنہ دوسرے موضوعات بالخصوص ادبِ اطفال پر مزید کتابوں کی اشاعت میرے پیش نظر تھی، اور اچھا ہی ہوا۔ ورنہ کچھ وقت اور گزر جاتا تو اِن میں سے بھی کئی افسانے ضائع ہو جاتے۔ میں اپنے مذکورہ دونوں کرم فرما حضرات کے ساتھ ہی سابق ایسوسئیٹ پروفیسر جناب شریف احمد قریشی کا بھی شکرگزار ہوں جن کی کتاب ''رام پور میں اردو افسانہ'' سے استفادہ کیا ہے۔ میں برادرم سید شریف میاں اور عزیزم عبدالباری وسیم کا تہہ دل سے ممنون ہوں جو میری ہر کتاب کی اشاعت کے وقت نہ صرف اپنے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں بلکہ جو کام بن پڑتا ہے اُسے انجام دے کر میرے لیے کام آسان بنا دیتے ہیں۔

کتاب کا نام میں نے اس مجموعے میں شامل ایک افسانے سے اس لیے اخذ کیا ہے کہ یہ دوسرے عنوانات کی بہ نسبت زیادہ افسانوی محسوس ہوا۔ خدا کرے آپ کو ''آخری تعاقب'' پسند آئے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع ہو رہی ہے اس لیے مذکورہ ادارہ کے جن ارکان نے اس کتاب کے مسودے کے مطالعہ اور کتاب کی منظوری میں تعاون دیا ہے۔ میں ان کا بھی شکرگزار ہوں۔

مرتضیٰ ساحلؔ تسلیمی

ادارہ الحسنات، کھنڈسار کہنہ، رام پور (یو۔ پی)

رابطہ: 9897645925

٭ ٭ ٭

تعارفی خاکہ

نام :مرتضیٰ علی خاں قلمی نام :مرتضیٰ ساحل تسلیمی

تعلیم :ایم۔اے،بی۔ایڈ تاریخ پیدائش :۳۰؍جون ۱۹۵۳ء

معاشی مشغلہ :دسمبر ۱۹۷۲ء تا اکتوبر ۱۹۹۴ء وابستگی شعبۂ ادارت ، ادارہ الحسنات رامپور برائے ماہنامہ بتول، ماہنامہ الحسنات، ماہنامہ نور، ھلال، وھادی (ہندی) بعدازاں اعزازی ادارت۔
درس وتدریس (ریٹائرڈ ٹیچر)، جولائی ۲۰۱۵ء سے ادارت 'الحسنات' نور' بتول وغیرہ

علمی مشغلے :شاعری، افسانہ نگاری، مزاح نگاری، اداریہ نویسی وغیرہ

خصوصی رُجحان :بچوں کا شعری ونثری ادب تخلیق کرنا۔

مطبوعات: ناول اور کہانیوں کی کتب ✿ نصیحتوں کے چراغ ✿ بھرت بن کی کھوج (ناول) ✿ بھولو راجا (ناول) ✿ جلوس ✿ بچھو ✿ بدلہ ✿ توبہ ✿ نٹ کھٹ ✿ تین دوست ✿ انصاف ✿ دُم کٹی لومڑی ✿ رحم دل ہاتھی ✿ لالچی گیدڑ ✿ سمجھدار گدھا ✿ مددگار چوہا ✿ ڈاکٹر بندر ✿ مگرمچھ کی سمجھ داری ✿ محنت کا صلہ ✿ چار کہانیاں ✿ شیر کا انصاف ✿ صبح کا بھولا ✿ گھوڑے کی دُم ✿ پک نِک ✿ مکار لومڑ ✿ دوستی ✿ بھلائی کا انعام ✿ عقل مند کچھوا ✿ کھوٹی اُٹھنی ✿ شام کا بھولا ✿ نقلی سورما ✿ نرم ٹہنی ✿ گھمنڈی مور ✿ چراغ سے چراغ جلتے ہیں ✿ جہادِ زندگانی میں.....

بچوں کی منظومات پر مشتمل شعری مجموعے: ✿ مہکتی کلیاں ✿ پھول اور کلیاں ✿ (پھول ✿ کلیاں) ✿ چاند ستارے

خواتین کے لئے : ✿ گھر گھر کہا کہانی ✿ کڑوی سچائیاں

تحقیقی کتب : ✿ تحریک اسلامی کے داعی مولانا محمد عبدالحیؒ..... حیات و خدمات ✿ ملی مسائل میں مساجد کا کردار۔

اعزازات : ✿ ایوارڈ اتر پردیش اُردو اکاڈمی برائے "ادب اطفال" ۲۰۱۴ء ✿ مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ ✿ اردو اکاڈمی اُتر پردیش کی رُکنیت ✿ ڈاکٹر ہتیش چند گپتا فیلوشپ ایوارڈ ✿ آسرا ایوارڈ ✿ شہید آصف شاہ میری قومی ایوارڈ ✿ خان امانت کمال میموریل ایوارڈ ✿ نشانِ امتیاز، بزمِ ہم مشرب ✿ سینئر صحافی ایوارڈ۔ پریس کلب، مرادآباد۔

وصیّت

نہ تو سلمیٰ بی کا مرض لاعلاج تھا اور نہ ہی رضوان میاں نے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی برتی تھی لیکن ہوا یہی کہ سلمیٰ بی جب بستر پر پڑ گئیں تو پھر نہ اُٹھ سکیں۔ اور آج تو صبح سے دو مرتبہ انہیں خون کی قے ہو چکی تھی بیگم صاحبہ اللہ کا کلام سینے سے لگائے دعا مانگ رہی تھیں۔ رضوان میاں بہن کے پاس غم کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ عیادت کے لئے آنے والی عورتوں کی نظریں مسلسل سلمیٰ بی پر ہی تھیں۔ آج سبھی کو ان کی حالت غیر یقینی سی لگ رہی تھی۔ مریض سے ہمدردی ہونا فطری بات ہے لیکن سلمیٰ بی یوں بھی ہمدردی کی زیادہ مستحق تھیں کہ اپنی عمر کے تیس سال گزارنے کے باوجود بھی سہاگ کی مہندی سے محروم تھیں اور غالباً یہی احساسِ محرومی ان کے مرض میں شدت کا باعث بنتا گیا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی رہیں۔ مایوسی اور افسردگی کا حصار اپنی گرفت مضبوط کرتا گیا اور وہ اس حال کو پہنچ گئیں حالانکہ اس میں ان کا اپنا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

وہ سترہویں سال میں تھیں کہ رشتے آنا شروع ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے تو خالہ جان نے ہی اپنے بیٹے توصیف علی خاں کے لئے پسند کیا تھا لیکن خان صاحب کے تعلقات چوں کہ سسرال سے کچھ اچھے نہیں تھے اس لئے انہوں نے انکار کر دیا۔ حالانکہ توصیف خوبرو اور لائق نوجوان تھے۔ مالی حیثیت میں بھی خان صاحب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ بیگم صاحبہ توصیف کو پسند بھی کرتی تھیں مگر خاں صاحب کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ لیکن سلمیٰ بی کے لئے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔

کچھ دن بعد ہی کریمن بوا شاکر علی خاں کے لڑکے کا رقعہ لے کر آئیں۔ شاکر علی خاں کا خاندان شہر کے معززین میں گنا جاتا تھا۔ وہ کمال زئی تھے۔ ان کے اجداد نواب برکت علی خاں کے دور حکومت میں منصرم باورچی خانہ رہے تھے انہیں شاہی حکومت سے سواری کے لئے ہاتھی اور بیش قیمت خلعت ملتی تھی۔ شاکر علی خاں کروڑوں کی جاگیر کے مالک تھے۔ بیگم صاحبہ اس رشتے سے بہت خوش تھیں لیکن خان صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ رکاب داروں میں کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ بیگم صاحبہ کی نظر میں یہ کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ لہٰذا اختلاف رائے نے تنازعہ کی شکل اختیار کر لی اور مہینوں باہم گفتگو کا سلسلہ منقطع رہا اور ایسا ہر سال چھ مہینے بعد ہوتا رہا۔

وقت گزرتا رہا۔

سلمیٰ بی کوئی ایسی بچی نہ تھیں کہ وہ والدین کے مابین اختلاف کا تجزیہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ آنے والے پیغامات اور ان کی بنیاد پر پیدا ہونے والی صورت حال سے پوری طرح باخبر رہتیں۔ والدین کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو وہ کھڑکی سے کان لگا کر سنتی رہتی تھیں۔ بیگم کے سمجھانے کے باوجود وہ یہی کہتے۔

''بیگم سلمیٰ صرف تمہاری ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے۔ ہمیں بھی اس کی فکر ہے۔ لیکن ہم تمہاری طرح اسے بوجھ تصور نہیں کرتے۔ پھر ہمارا قصور بھی کیا ہے جب کوئی معقول رشتہ آئے گا ہم ہرگز انکار نہیں کریں گے۔

''لیکن معقول رشتہ پرستان سے تو آنے سے رہا۔ یہی رشتے ہوتے ہیں آپ اس نزاکت پر غور کیجئے کہ جس گھر سے بار بار رقعے واپس ہو جائیں گے تو دوسرے کیسے ہمت کریں گے۔ سات کلوں سے کون پورا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی کھوٹ تو سبھی میں ہوتی ہے۔ اگر آپ میرے خاندان کو چھاننے لگیں تو وہ بھی آپ کے معیار پر پورا نہ اترے گا۔''

لیکن یہ بحث ہمیشہ کسی فیصلہ پر پہنچے بغیر ہی ختم ہو جاتی اور خان صاحب کی وہی بے نیازی قائم رہتی۔ رضوان میاں اگرچہ بڑے بھائی تھے لیکن ابو کے ہوتے ہوئے ان کی ایک

نہیں چلتی تھی۔ وہ دبی زبان سے اپنی رائے کا اظہار کر کے خاموش رہتے تھے۔ وہ بیوی بچوں والے تھے اور انہیں اپنے مسائل سے ہی دل چسپی تھی لیکن جب امی انہیں ان کے ابو کے رویئے، سلمٰی بی کی ڈھلتی عمر، ان کی خاموشی اور کسی ناگہانی خطرے کا احساس دلاتیں تو وقتی طور پر وہ متاثر ہو جاتے اور مجرموں کی طرح ابو کی بارگاہ میں اپنے احساسات کا اظہار کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ ان کی درخواست رد کیوں کر دی جاتی ہے۔ دراصل وہ مصلحت پسندی سے کام لے رہے تھے احتجاج کرنے کی ہمت ان میں نہیں تھی کسی قسم کی ضدان کے لئے اقتصادی مسائل بیدار کرنے کا موجب ہو سکتی تھی۔

کریمن بوا بھی ہار گئی تھیں، حالانکہ انہوں نے سلمٰی بی کا رشتہ کرانے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے بیگم صاحبہ سے صاف صاف کہہ دیا۔

''بیگم صاحبہ! جب میاں جی کا ارادہ سلمٰی بیٹی کو رخصت کرنے کا ہے ہی نہیں تو پھر میں کیوں اپنے پیر توڑوں؟ میں کاہے کو اپنی عزت خراب کروں؟ لیکن بیگم صاحبہ کے اصرار پر ایک بار پھر رضا مند ہو گئیں۔ وہ کسی ایسے بے داغ رشتے کی تلاش میں تھیں جیسے خان صاحب۔ اگر چہ کئی مہینے لگ گئے لیکن اس بار وہ مطمئن تھیں کہ خاں صاحب کو انگلی رکھنے کی نوبت نہیں آئے گی اور جب فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ خان صاحب کے مکان میں داخل ہوئیں تو بیگم صاحبہ نے کہا: ''کریمن بوا! تم تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کہاں رہنے لگی ہو؟''

کریمن بوا نے اپنا بوتل نما سفید برقع اتار کر بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا بی عید کا چاند واند تو کیا ہو گئی۔ اب بوڑھی ہڈیوں سے چلا پھرا نہیں جاتا۔ جب دم تھا تو جوگی کا سا پھیرا مارتی رہتی تھی۔''

''میں نے تمہیں اس دوران کئی بار یاد کیا۔''

''مجھے تو خود ہی فکر تھی بی! مگر کیا کرتی ڈھنگ کی جگہ ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مگر وہ کہتے نہیں ہیں کہ ڈھونڈھنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ ایک جگہ بات بن گئی یہ لو.....''

کریمن بوا نے دوپٹے کا پلو کھول کر پرس نکالا۔ بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں ایک بار پھر

چمک آگئی۔ ''یہ کہاں سے لائی ہو؟''

''کھول کر دیکھ لیجئے۔اب میں کیا بتاؤں'' کریمن بوا نے شوخی سے کہا۔

بیگم صاحبہ نے پرس لے لیا۔ پرس میں ایک رقعہ سینٹ میں بسا ہوا ایک رومال اور کچھ سفید الائچیاں تھیں۔ ''بوا! یہ ایک دم رقعہ کیسے لے آئیں، ایک لڑکی.....''

''ہاں، انہوں نے سلمیٰ بی کو دیکھ لیا ہے جمعہ کے دن دو عورتیں آئی تھیں نا آپ کے یہاں۔'' کریمن بوا نے بیگم صاحبہ کی بات کاٹ کر کہا۔

''مگر وہ تو کرائے کا مکان تلاش کرنے آئی تھیں۔''

''وہ مکان وکان تلاش کرنے نہیں سلمیٰ بی کو ہی دیکھنے آئی تھیں.....اور چلتا پھرتا دیکھ گئیں۔''

''تو کیا سلمیٰ انہیں پسند آگئی۔''

''پسند کیوں نہیں آتی۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھیں وہ سلمیٰ بی کی۔''

''بوا! اگر سلمیٰ بی نمٹ جائیں تو مجھ پر سے منوں کا بوجھ کم ہو جائے۔''

''مگر بی! میاں جی کو تو کوئی فکر ہی نہیں ہے میں تو جو رشتہ لاتی ہوں اس میں کیڑے نکال دیتے ہیں۔اب اسے آخری سمجھئے۔ مجھے تو آپ کی محبت اور سلمیٰ بی کی ماتا مجبور کرتی ہے ورنہ کوئی کیوں بار بار شرمندہ ہو۔'' کریمن بوا نے کہا اور برقع پہنتے ہوئے بولیں۔

''لاؤ بی ایک کترا اور کھلا دو۔اب میں جواب کے لئے آج ہی کے دن آؤں گی۔''

بیگم صاحبہ نے کریمن بوا کی چٹکی میں پان دے کر چھالیہ اور تمبا کو ہتھیلی پر رکھ دی۔

رات کو خان صاحب جب کھانے سے فارغ ہو کر کمرے میں پہنچے تو بیگم صاحبہ نے پرس ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے سلمیٰ بی کے لئے ایک اچھا رشتہ بھجوا دیا۔''

''اچھا!'' خان صاحب نے کہا اور رقعہ کھول کر پڑھنے لگے۔ ''اچھا اچھا یہ بلاغت یار خاں کا بھتیجا ہے۔کمال ہے بیگم خواہ مخواہ کہہ رہی تھیں اچھا رشتہ ہے۔'' بیگم صاحبہ کے چہرے کا

رنگ بدل گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے کہا'' کیا خرابی نظر آ گئی آپ کو؟''

''میں بتاؤں۔'' پھر قدرے توقف کے بعد بولے'' جو لڑکے کا چچا ہے نا بلاغت یار خاں، اس نے اپنی نوکرانی سے نکاح کر لیا تھا خدا جانے کس قوم کی ہو گی وہ۔ پھر لڑکا وکیل ہے وکالت بھی کوئی پیشہ ہے، سراسر ناجائز کمائی۔''

''خدارا چھوڑیئے ان باتوں کو۔ اس کے چچا سے آپ کو کیا لینا..... اور وکالت! وہ ایک معزز پیشہ ہے آپ کو کیا؟ اپنے اعمال کے لئے ہر شخص خود جواب دہ ہو گا؟۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولیں'' اس رشتہ سے بھی انکار کر دیا تو پھر کس سے بیاہیں گے بیٹی کو۔ جائز ناجائز کا فتویٰ تو دے رہے ہیں لیکن آپ نے اب تک کتنا پاس لحاظ رکھا ہے شریعت کا؟ آپ نے کتنے رشتوں کو جانچا ہے مومن کی نظر سے۔'' بیگم صاحبہ جذباتی ہو گئیں۔

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''یہی کہ یہ رشتہ واپس نہیں ہو۔''

''ہو گا۔''

''نہیں ہو گا۔''

''ہٹ جایئے ہماری نظروں کے سامنے سے، ورنہ ہمارے منھ سے کچھ نکل جائے گا۔''

اور بیگم صاحبہ اسی وقت رضوان میاں کی طرف چلی گئیں۔ وہ تمام رات سلمٰی بی نے جس طرح گزاری وہی جانتی تھیں۔ کریمن بوا کا لایا ہوا پرس تو جوں کا توں واپس ہو گیا لیکن بیگم صاحبہ نے پھر خان صاحب کا سامنا نہیں کیا۔ جب وہ گھر سے چلے جاتے تو بیگم صاحبہ آ جاتیں اور جیسے ہی ان کی آہٹ پاتیں دوپٹے کی آڑ کر کے کھڑکی کے راستے رضوان میاں کی طرف پہنچ جاتیں۔ خان صاحب کا سامنا انہوں نے اس وقت کیا جب چند ماہ بعد دل کا دورہ پڑنے سے ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔

سلمٰی بی پہلے ہی کم گو اور خاموش طبیعت لڑکی تھیں۔ اب حالات نے انہیں بالکل ہی گنگ کر دیا تھا۔ وہ کام کاج سے فارغ ہوتیں، سوچ بچار میں لگ جاتیں۔ نماز پڑھنے بیٹھتیں تو

گھنٹوں مصلّے پر گزار دیتیں۔ آنے جانے والوں سے نہ پہلے زیادہ بات کرتی تھیں اور نہ اب۔ والدین کے مابین ہونے والے تنازعات میں وہ کسی کی طرف دار نہیں تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا۔ البتہ دیکھنے والے ضرور محسوس کر سکتے تھے۔ کہ کوئی غم انہیں گھن کی طرف چاٹ رہا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھیں۔ چونکہ گھر میں فساد ان کے تعلق سے ہوتا تھا اس لئے ان میں زندگی سے بیزاری کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ طبیعت کتنی ہی خراب ہوتی وہ کسی سے نہ کہتیں۔

ایک دن امی ہی نے کہا ''بیٹی! یہ مستقل کھانسی اچھی علامت نہیں ہے۔ تم جب رات کو کھانستی ہو تو میری نیند اڑ جاتی ہے۔ تم کیا جانو اولاد کی مامتا کیا ہوتی ہے۔ چلو ڈاکٹر کو دکھا دو۔ زکام پک گیا ہے..... پُٹی پُٹی کی دواؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔ مگر انہیں کیا معلوم کہ پرسوں رات انکی بیٹی کو خون کی قے بھی ہو چکی ہے..... اور پھر رفتہ رفتہ وہ بستر پر پڑ گئیں۔ امی کے کہنے پر رضوان میاں نے یکے بعد دیگرے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا، ایکسرے کرائے، دواؤں کا کورس شروع ہو گیا مگر افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

آج صبح سے ان کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ دو مرتبہ خون کی قے کر چکی تھی..... اچانک انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ امی سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ بھائی جان برابر کرسی پر تھے اور ثمینہ اپنے ابو کے سرہانے کھڑی تھی۔ سلمٰی بی کو آہستہ سے جنبش دی اور بھائی جان اپنا کان ان کے ہونٹوں تک لے آئے۔ انہوں نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

''بھائی جان! آپ ثمینہ کو اس حال پر نہ پہنچانا، اور بھائی جان مجھے ابو کے قریب دفن مت کرنا۔''

بھائی جان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہیں روتا دیکھ کر کون اپنے آنسو ضبط کر سکتا تھا۔

❁ ❁ ❁

رشتے کا کرب

نجمہ بی کو بہت غصہ آرہا تھا کہ وہ کون سے بے فکرے والدین ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کو ڈوبنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ بچہ رو رہا تھا اور وہ اُسے گود میں اُٹھائے اس کے والدین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ڈیم کے لان میں بیٹھے ہوئے ایک جوڑے سے انھوں نے طنزاً پوچھا بھی کہ "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا" اور انھوں نے مسکرا کر لاعلمی ظاہر کردی۔ پھر بچے نے ہی انگلی ایک شخص کی جانب اُٹھائی تو وہ وہیں پہنچ گئی..... "یہ بچہ آپ کا ہے؟"

"جی۔"

"آپ یہاں وظیفہ پڑھ رہے ہیں اور بچے کو یونہی چھوڑ دیا کہ جہاں چاہے چلا جائے....."

وہ قدرتی مناظر کے حصار سے باہر نکلتے ہوئے بولے "جہاں چاہے سے کیا مطلب ہے یہ تو یہیں اپنے بہن بھائیوں میں کھیل رہا تھا..... دیکھئے وہ دونوں کھیل رہے ہیں۔ یہ بھی اُنہی کے ساتھ تھا۔"

"تو پھر مجھے پرائے بچوں کو اُٹھائے پھرنے کا شوق ہے!" وہ بھنا گئی۔ "جناب یہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر پانی میں جارہے تھے۔ وہ تو میں نے دیکھ لیا اور بھاگ کر پکڑ لیا۔ ورنہ یہاں سے روتے ہوئے جاتے اور بیگم کو جواب دیئے بن نہ پڑتا۔"

''محترمہ! تھوڑا سا ریلکس ہو جایئے۔ دیکھئے میری بیگم ابھی کوئی نہیں ہیں۔ میں ان بچوں کا چچا ہوں۔ آج اتوار ہے اس لئے انھیں تفریح کرانے لے آیا ہوں۔'' انھوں نے بڑی سنجیدگی سے بتایا تو اس کی جھنجھلاہٹ بھی کافور ہوگئی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کرنے کی ٹریننگ کر رہے ہیں مگر آپ کے اس تجربے میں نہ صرف اس کی بلکہ میری بھی جان جا سکتی تھی۔ میں نے آخری سیڑھی پر اسے پکڑا ہے۔ میں خود پھسلتے پھسلتے بچ گئی۔''

''ارے آپ کو تو بہت سے نوجوان بچا لیتے۔'' وہ کچھ شوخ ہو گئے۔ ''چلئے خیر ہوگئی ورنہ کتنے ہی لوگ کہتے ''حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔''

''اور میرے والدین کا کیا حال ہوتا۔'' ان کی اس بات پر نجمہ کا پارہ پھر چڑھا۔

''تین دن رو دھو کر وہ بھی سوچ لیتے چلو سستے چھوٹے۔''

نجمہ بی لاکھ حاضر جواب سہی مگر ایک غیر نوجوان کے بے تکلفانہ جملوں کے وار سے بچاؤ کی پوزیشن میں آگئیں۔

''آپ کو تو بچوں کی دیکھ بھال کرنا خوب آتی ہے نا!۔''

''کیا مطلب؟'' حالانکہ وہ اس کے جملے میں پوشیدہ شرارت کو خوب محسوس کر چکی تھی مگر سنبھلنے سے پہلے ہی اگلا وار اُس پر ہو گیا۔

''مطلب وطلب کچھ نہیں آپ کی صلاحیت کا اعتراف کر رہا ہوں۔ اچھا چھوڑیئے آپ بہت دلچسپ شخصیت کی مالک ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ میرا نام غضنفر علی خاں ہے۔ بنک میں اسسٹنٹ منیجر ہوں۔ معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور آپ؟'' انھوں نے کہا تو نجمہ بولیں ''اچھا خدا حافظ۔''

''میں آپ سے ایسی غیر اخلاقی حرکت کی بالکل توقع نہیں رکھتا۔'' غضنفر علی خاں نے کہا۔ ''کیا میں کوئی اوباش لڑکا لگتا ہوں کہ خدانخواستہ آپ کی عزت وعصمت پر کوئی دھبہ آجائے گا۔''

''مجھے نجمہ بی کہتے ہیں گرلس کالج میں بی۔اے فائنل کی طالبہ ہوں اور.....بس اتنا ہی کافی ہے۔''

''جی نہیں.....اتنا تعارف تو کسی اوباش یا منچلے لڑکے کے لئے کافی ہے مگر کسی شریف انسان کے لئے تو گھر کا پتہ درکار ہوتا ہے۔''

پہلی بار وہ عجیب سی پس وپیش کا شکار ہوئی تھی۔ جو لڑکی انتہائی ذہین اور حاضر جواب تصور کی جاتی تھی وہ غیر متوقع حالات سے دوچار تھی۔

''دیکھئے میری سہیلیاں مجھے اشارے کر رہی ہیں۔''

''اپنا پتہ بتاتی جایئے۔''

''آپ پتہ کا کیا کریں گے؟'' نجمہ بی نے بے بسی سے سوال کیا۔

''کچھ نہیں کریں گے۔ اگر کچھ کریں گے تو شریفانہ طریقے سے استعمال کریں گے۔ آپ پتہ نہیں بتائیں گی تو جتنا کچھ آپ نے بتادیا ہے وہ مکمل پتہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے لیکن یہ قلق بہر حال رہ جائے گا کہ آپ نے ہماری خواہش کو رد کردیا۔'' اور غضنفر علی خاں کی اس وضاحت کے بعد اُس نے پتہ بتا ہی دیا اور پھر وہ اپنی دوستوں میں آ گئی.....مگر ایک عجیب سی کیفیت لئے ہوئے جس میں کچھ خدشات تھے تو کچھ سرور بھی.....پھر پانچ بجے شام کو تمام لڑکیاں پہلے کالج اور پھر اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئیں۔

○

نجمہ بی شہر کے ایک متوسط اور باوقار خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُن کے والد شریف اللہ خاں ایک ہمدرد، بااُصول اور قابلِ استاد رہے تھے اور حال ہی میں انھوں نے انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لیا تھا۔ شہر کا پڑھا لکھا طبقہ ان کی عزت کرتا تھا۔ بڑے خوش پوش وخوش اخلاق انسان تھے۔ خاندانی شرافت، وجاہت اور حسن نہ صرف اُن کے بلکہ اُن کے بچوں کے چہروں سے ظاہر ہوتا تھا..... نجمہ بی کے ایک بڑے بھائی شریف اللہ خاں کسی دوسرے شہر میں پوسٹڈ تھے اور دو بڑی بہنیں سلمیٰ بی اور نغمہ بی تھیں۔ سلمیٰ بی کی شادی بھی

دو سال قبل ہو چکی تھی۔ اب نغمہ بی کا نمبر تھا جنہیں دیکھنے آئے دن خواتین آتی رہتی تھیں۔ نجمہ بی بھی کم جوان نہیں تھیں بلکہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ پُرکشش تھیں۔ چہرے پر ہمیشہ شوخ مسکراہٹ رہتی۔ انتہائی حاضر جواب اور ذہین تھیں لیکن ابھی زیرِ تعلیم تھیں اور ایک بہن سے چھوٹی بھی اس لئے وہ لڑکیوں کی تلاش میں آنے والی خواتین کے سامنے اپنے فطری انداز اور مناسب لباس میں ہوتیں اور خوب کھل کر گفتگو بھی کرتیں۔ جب کہ نغمہ بی کو سجا سنوار کر مہمان خواتین کے سامنے لایا جاتا.....شادی کی اس روایتی منڈی میں آنے والے نہ تو اپنے اسٹیٹس اور مقام کو دیکھتے اور نہ ہی شرافت اللہ خاں کے۔ بقول بزرگوں کے بیری ہوتی ہے تو اینٹیں آتی ہی ہیں۔ چنانچہ کچھ رشتے تو خواہشات اور مطالبات کی بھینٹ چڑھ جاتے اور کچھ ان مل اور بے جوڑ ہونے کی وجہ سے۔ نغمہ بی آنے والیوں کے سامنے سجا بنا کر لائی جاتیں، دکھائی جاتیں اور کُڑھنے کے لئے چھوڑ دی جاتیں۔ نغمہ بی کو یہ سب پسند نہیں تھا لیکن خاندانی رسم اور فطری شرم و حیا کی وجہ سے زبان نہیں کھول سکتی تھیں جب کہ نجمہ بی کا مزاج اس کے برعکس تھا۔ وہ بقول دادی بی کے منہ پھٹ اور لق لق بولتی رہنے والی لڑکی تھیں۔

O

نجمہ بی جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں اماں بی نے کہا ''خدا کا شکر ہے کہ تو آ گئی۔ باپ مجھ پر خفا ہو رہے تھے کہ تم نے پکنک ٹور کی اجازت ہی کیوں دی۔ زمانہ بہت خراب ہے، اس پر تمہاری دادی بی اور چر کے دے رہی تھیں۔ ہم نے ایسی دیدے پھٹی لڑکیاں نہیں پالیں۔ ہم نے اپنی بیٹیوں کو ایسے اسکولوں میں نہیں پڑھایا جہاں لڑکیاں بے نتھے بیل کی طرح چھٹا پھرتی پھریں۔ بیٹیاں اپنے قبضے میں ہی اچھی ہوتی ہیں۔''

وہ سیدھی دادی بی کے پاس پہنچیں جو عموماً عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان تخت پر جائے نماز بچھائے پڑھتی رہتی تھیں۔ نجمہ بی نے جاتے ہی کہا..... ''دادی بی السلام علیکم۔''

دادی نے تسبیح کو جائے نماز پر رکھا انگلیوں پر کچھ پھونکا پھر دونوں ہاتھ اپنے منہ پر پھیرے نجمہ بی کو قریب کر کے اس کے گریبان میں پھونکیں ماریں اور پھر ایک جھٹکے سے اُسے

دُور کرتے ہوئے کہا ''چل ہٹ میں تجھ سے بات نہیں کرتی۔ اتنی دیر میرے دل کا کام تمام ہوگیا۔ تیرے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے۔ پتہ نہیں تیری قسمت میں کیا لکھا ہے کون پوچھے گا ایسی لڑکی کو۔''

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتیں کہ نجمہ بی نے اُن کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا ''ارے دادی! تم اپنی اس پوتی کی فکر مت کرو اسے تو سب ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔''

''چل ہٹ میرے سامنے سے، تو نے تو ساری غیرت طاق پر رکھ دی ہے جس دن کوئی نیک بد ہو گیا تو منہ دکھانے کے نہیں رہیں گے.....'' نجمہ بی کھسیانی ہو گئیں یہ دادی بھی کیسی کیسی بدفالیں منہ سے نکالتی رہتی ہیں۔ پھر زور سے کہا ''اللہ نہ کرے۔'' اور اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

○

''امی باجی کا کیا رہا؟'' نجمہ بی نے چائے سپ کرتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''نغمہ تو انھیں پسند آ گئی مگر.....''

''مگر مطالبات کی فہرست لمبی تھی اس لئے آپ نے یہیں بات ختم کردی، یہی نا!۔''

''نہیں، لڑکا معمولی پڑھا لکھا ہے۔ باغات کے ٹھیکے لیتا ہے۔''

''ہر بار یہی ہوتا ہے کبھی آپ کی طرف سے اور کبھی دوسری طرف سے۔ کوئی وجہ ہوتی ہے اور بات ٹائیں ٹائیں فش ہو جاتی ہے۔'' نجمہ بی نے سنجیدگی سے کہا ''امی اب یہ باتیں چھوڑ دیجئے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ شاندار استقبال، تواضع اور بیٹی کو بار بار سجا بنا کر دلہنوں کی طرح بٹھانا کہاں تک مناسب ہے۔ آپ کی بیٹیاں کوئی بدصورت نہیں ہیں، بدسیرت نہیں ہیں تو پھر آپ کیوں فکر مند ہیں جس کی غرض ہوگی وہ انھیں سر آنکھوں پر قبول کرلے گا۔''

ماں نجمہ کی معقول بات سے متفق تھیں بولیں۔ ''بیٹی تم ٹھیک کہتی ہو مگر تمہاری دادی سابقہ روایات کی پاسدار ہیں۔ تم دیکھتی ہو اُن کے سامنے میں منہ نہیں کھول سکتی۔''

''ٹھیک ہے آپ باجی کو جتنا چاہیں بیوقوف بنالیں جتنا چاہے احساسِ کمتری میں مبتلا

کریں مگر میں نہیں بننے والی ایسا تماشا۔"

"بیٹی لڑکیوں کو اس طرح کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ اپنی زبان پر قابو رکھو۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کا اس طرح بولنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ بات پھیل گئی تو....."

"میری شادی نہیں ہوسکے گی" نجمہ بی نے ماں کی بات کاٹ کر کہا۔ "بس رہنے دیجئے اماں! اللہ کی طرف سے جس کام کا وقت معیّن ہے وہ ہو کر رہے گا اور اگر نہیں ہے تو پھر کوئی کچھ کرلے وہ کام نہیں ہوگا۔ دادی بی بھی بار بار یہی رٹ لگاتی رہتی ہیں کہ تجھے کوئی کرنے نہیں آئے گا.....اور اب آپ بھی۔ مجھے اچھی نہیں لگتی یہ بات۔" وہ جذباتی ہوگئیں۔

"بیٹی لڑکیوں کا زبان پر قابو رکھنا ضروری ہے۔ دادی بی بھی تمہاری بھلائی کے لئے ہی کہتی ہیں اور تمہاری طرف سے تشویش میں مبتلا رہتی ہیں۔"

"وہ وقت سے پہلے کیوں تشویش میں مبتلا رہتی ہیں.....'قاضی جی کیوں دُبلے شہر کے اندیشے میں' والی بات ہے۔ اللہ پر صابر و شاکر کیوں نہیں رہتے ہم لوگ۔ آخر کیوں والدین لڑکیوں کو بوجھ تصور کرکے فکرمند رہتے ہیں۔"

امّی پھر کچھ نہیں بولیں اور باہر آکر کام میں لگ گئیں۔

نجمہ بی کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلیں تو ابو سے سلام علیک ہوئی "بیٹے پکنک ٹور کیسا رہا؟" انھوں نے پوچھا۔

"بہت اچھا رہا ابو۔" اُس نے جواب دیا۔

"بہت خوب! تم بجائے ڈانٹنے کے اور شہ دے رہے ہو۔ یہاں ہمارا دم اور بے پورے ہو رہا تھا۔" دادی بی نے کہا تو ابو مسکرا کر رہ گئے لیکن نجمہ کو پھر جھنجھلاہٹ سوار ہوگئی۔

"دادی بی! آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں.....میں کوئی بُری لڑکی ہوں؟۔"

"تم بُری نہیں ہو مگر زمانہ تو برا ہے۔"

"دادی بی! آپ کی طرح آپ کی سوچ بھی بوڑھی ہوگئی ہے۔"

"کیا بک رہی ہے.....قلا مغنی کہیں کی۔ جا اپنا کام کر۔ ہم نے دُنیا دیکھی ہے۔" دادی

بی کا بھی موڈ آف ہوگیا۔ ''تجھے چھٹا بجار بنادیا ہے۔ تیرے دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے۔'' وہ تم سے تُو پراُتر آئیں۔

نجمہ بی نے دیکھا ابو یہ نوک جھونک سُن رہے ہیں تو اُس نے اپنی امیج سدھارنے کے لئے دادی کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ''دادی بی! آپ نہ جانے کون سی اُردو بولتی ہیں۔ قلاماغنی، دم اورے پورے ہونا..... کیا مطلب ہے اس کا؟''

''مجھے نہیں معلوم..... میں نے کسی اسکول میں نہیں پڑھا ہے۔ جا اپنا کام دیکھ میری نماز کا وقت ہوگیا ہے۔'' اور نجمہ بی نے دادی کے رُخسار اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے کہا۔ ''میری اچھی دادی بی۔'' تو انھوں نے اُس کے ہاتھ الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے بڑی مکّار ہے چوہیا کو مار کر گوبر سنگھار ہی ہے۔'' پھر اُسے پیار کرتی ہوئی بولیں ''میرے لال! ایک نبٹ گئی۔ دوسری بھی آج نہیں تو کل اپنے گھر کی ہو ہی جائے گی۔ مجھے تیری فکر ہے۔ تجھے کون پسند کرے گا۔''

''میری فکر مت کیجئے۔ اللہ میاں نے مجھے آپ کی خدمت کے لئے بھیجا ہے۔ میں یہیں رہوں گی، اور جب آپ کو میری ضرورت نہیں رہے گی تو پھر کوئی اچانک آسمان سے اُترے گا اور پریوں کے رتھ میں بٹھا کر لے جائے گا دادی! اللہ پر بھروسہ رکھئے۔''

''اللہ تیرا نصیب اچھا کرے۔'' وہ کہتی رہ گئیں اور نجمہ بی امّی کا ہاتھ بٹانے کچن میں پہنچ گئیں۔

○

نجمہ بی رات کو جب بستر پر لیٹیں تو انھیں دو فکریں لاحق تھیں۔ ایک تو یہ کہ آج جس نوجوان سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے اپنا تعارف کرانے پر مجبور کردیا تھا کہیں وہ کوئی غلط قدم نہ اُٹھا بیٹھے۔ حالانکہ اُس سے گفتگو کر کے اُنھیں اچھا لگا تھا اور وہ اُس کی وجیہ شخصیت، دلآویز مسکراہٹ اور خوش کلامی سے اندر ہی اندر محظوظ ہوتی رہی تھیں..... اور دوسری فکر یہ تھی کہ اگلے ہفتے ضلع پریشد کے ہال میں ایک ڈبیٹ کا پروگرام تھا جس میں کالج کی طرف سے انھیں

حصّہ لینا تھا۔ موضوع اُن کا پسندیدہ تھا۔ اُنھیں ''رسم ورواج..... سماج کے لئے مضر یا مفید'' میں سے کسی ایک پر بولنا تھا اور نجمہ بی نے اپنے مزاج کے مطابق رسم ورواج کے نقصانات پر بولنا طے کیا تھا۔ یوں تو وہ اس موضوع پر گھنٹوں بے تکلف گفتگو کر سکتی تھیں لیکن جہاں شہر کے اہلِ علم صاحبان ہوں اور ججز ہر لفظ اور ہر ایکشن کو نوٹ کر رہے ہوں وہاں نجمہ بی کے لئے تقریر کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

ایک ہفتہ پر لگا کر اُڑ گیا۔ وہ دوسرے پارٹی سپینٹ کے ساتھ ہال میں موجود تھیں کہ اُن کی نظر اپنے والد پر پڑی..... ''یا اللہ ابو کے سامنے میں کیسے بولوں گی؟ اُنھوں نے دل میں سوچا پھر اپنے سر کی یہ پُر مزاح بات یاد آ گئی کہ جب تم تقریر کرو تو یہ سمجھ کر کرو کہ یہ سب لوگ جو ہال میں بیٹھے ہیں بہت کم علم ہیں یہ کچھ نہیں جانتے۔ اس خیال سے انھیں تقویت حاصل ہوئی۔ پروگرام شروع ہوا۔ زیادہ تر شرکاء نے رسم ورواج کی موافقت میں تقاریر کیں، لیکن جب نجمہ بی کا نام پکارا گیا تو پروگرام کنڈکٹ کرنے والے نے رسم ورواج کی مخالفت میں بولنے کا بھی اعلان کیا۔ نجمہ بی اسٹیج پر آئیں۔ مائک سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اُس نے آغاز کیا اور پھر جیسے جیسے اُن کا اعتماد بڑھتا گیا اُن کے دلائل اور آواز کے زیر و بم نے سامعین کے دل جیت لئے۔ جب تک وہ تقریر کرتی رہیں ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ نجمہ بی نے معاشرہ کی مختلف تقریبات کے نہایت مؤثر دلائل سے بخئے اُدھیڑ دیئے۔ اُن کی ہر بات گویا سامعین کے دل کی آواز تھی اور جب وہ تقریر ختم کر کے نیچے اُتر رہی تھیں تو چونک گئیں۔ آگے سے دوسری ہی رو میں غضنفر علی خاں بیٹھے تھے۔ نظریں چار ہوتے ہی انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر پھر تالیاں بجا کر داد دی۔ وہ ایک دم لرز گئیں۔ ''اللہ نہ کرے وہ کچھ کہہ دیں یا ملاقات کے لئے اُٹھ آئیں تو ابو بھی موجود ہیں، اُس کی بڑی رُسوائی ہو جائے گی۔ مگر وہ واقعی شریف انسان تھے۔ وہاں اجنبیت کی دیوار حائل ہی رہنے دی۔

شرافت اللہ خاں آج بہت خوش تھے اور اپنی بیٹی پر فخر محسوس کر رہے تھے جس نے ڈبیٹ میں نہ صرف پہلا انعام حاصل کیا تھا بلکہ رسم ورواج کی خرابیوں کو جتنے دلائل کے ساتھ پیش کیا

تھا وہ اٹھارہ بیس سال کی لڑکی کے لئے مشکل کام تھا۔ بالخصوص شادی بیاہ کے رشتوں اور طریقۂ انتخاب پر اُنھوں نے غیر شادہ شدہ لڑکیوں کے جذبات واحساسات پر جتنے مؤثر انداز میں روشنی ڈالی تھی۔ وہ کتنے ہی والدین کے لئے لمحۂ فکریہ تھی۔ نجمہ بی کے آنے سے قبل ہی وہ گھر آ کر اپنی بیگم کو سب کچھ سنا چکے تھے اور وہ بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں..... مگر دادی بی تھیں کہ دانتوں میں اُنگلی دبائے سن رہی تھیں، حالانکہ وہ اُن سے مخاطب تھے ہی نہیں پھر بھی وہ بول پڑھیں..... ''تجھے بھی شیشے میں اُتار لیا۔ شاباش باپ ہو تو ایسا!'' اور وہ مسکرا دیئے۔ ''وہی سب بکھانا ہوگا جو وہ گھر میں بکھانتی ہے۔'' دادی بی نے فقرہ کسا۔ ''ارے ہمارا کیا۔ کٹے گی تو ماں باپ کی کٹے گی۔ ہم آج ہیں کل نہیں ہوں گے۔'' اب وہ ماں سے کیا کہتے احتراماً خاموش ہی رہے۔

اسی وقت نجمہ بی آ گئیں تو باپ نے اُنھیں اپنے قریب کرتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور شاباشی دی۔ امّی بھی خوش تھیں۔ وہ یہ دیکھ کر خوش اور مطمئن ہو گئیں۔

○

نغمہ بی کی شادی کو ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے اور نجمہ بی بھی بی۔ اے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اب اہلِ خانہ کو کسی کی فکر تھی تو وہ نجمہ بھی ہی تھیں۔ گو کہ انھیں نہ شادی کا ارمان تھا اور نہ انتظار..... مگر یہ اندیشہ ہر دم رہا کرتا تھا کہ کہیں دادی بی کو کچھ کہنے کا موقع نہ مل جائے کہ ایک انہونی ہو گئی۔ شرافت اللہ خاں کے ایک شناسا معزز شخص نے ایک لفافہ انھیں لا کر دیا اور بتایا یہ میرا بھانجہ ہے۔ وہ اندر آئے نشست گاہ کھولی اور مہمان کو بٹھا کر گفتگو کرنے لگے۔

شرافت اللہ خاں نے کہا ''بھائی آپ کے گھر کی خواتین نے میری بچّی کو دیکھا نہیں ہے۔ پہلے لڑکی کو پسند کیا جاتا ہے تب بات آگے بڑھتی ہے۔''

تو انھوں نے بتایا..... ''انسپکٹر صاحب! آپ کا خاندان کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے اور لڑکی کو ایک فنکشن میں دیکھ لیا گیا ہے۔ جن خیالات کی آپ کی بچّی ہے اُس کے لئے یہی مناسب ہے۔''

شرافت اللہ خاں نے رقعہ پڑھ کر کہا۔''اچھا یہ شمشیر علی خاں کے صاحبزادے ہیں..... سبحان اللہ۔''

اور جب اُنھوں نے اپنی بیگم کو رُقعہ تھماتے ہوئے کہا''جیسی نیت ویسے فرشتے'' آپ کی بیٹی کا رشتہ آیا ہے اور میں بتادوں لڑکا بہت اچھا ہے میں اُسے جانتا ہوں۔گھرانہ بہت اچھا ہے.....آپ جب کہیں میں منظوری بھیج دوں۔''

''غضنفر علی خاں.....''نام تو بڑا ثقیل ہے۔''انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نجمہ بی نے یہ نام سنا تو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر کمرے میں گھس گئیں اور بیڈ پر اس طرح گر گئیں جیسے وہ شرما نہیں رہی ہوں بلکہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوں۔''

چند ماہ بعد نہایت سادہ اور پُر وقار تقریب میں نجمہ بی بھی بابل کا گھر چھوڑ کر پی کے گھر رخصت ہوگئیں.....اور دادی بھی اپنی تیز طرار پوتی کے خوشگوار مستقبل کے لئے خوشی کے آنسوؤں کے درمیان دُعا مانگتی رہ گئیں۔

❁ ❁ ❁

پُرانی چیز

گزشتہ دس گیارہ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ خانصاحب اور بیگم کسی رشتہ پر متفق ہوئے تھے۔ ورنہ جب بھی کوئی رشتہ آتا اور دونوں میں اختلاف تنازعہ کی شکل اختیار کر لیتا تو مہینوں تک باہم گفتگو کا سلسلہ بھی ختم ہوجاتا اور نسیم بی ہی دونوں کے درمیان پیغام رسانی کی ذمہ داری نبھاتیں۔ حالانکہ امکان اس بار بھی یہی تھا کہ ہمیشہ کی طرح دونوں کے درمیان اتفاقِ رائے کی نوبت نہیں آئے گی لیکن خاں صاحب نے ہی سمجھوتہ کرلیا اور فیصلہ بیگم پر چھوڑ دیا۔ اُنہوں نے نہ تو پسندیدگی کا اظہار کیا اور نہ ہی کسی قسم کی مخالفت۔ بس اتنا ہی کہا کہ تم جانو اگر تمہاری مرضی یہی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ معلومات کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ انہیں دنیا جانتی ہے۔ ذات بھی کھری ہے اور اللہ نے پیسہ اور بات بھی خوب دی ہے۔ ہوا یہ تھا کہ آج خاں صاحب کے کچہری جانے کے بعد امجدی بوا آگئی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے جب ان سے نہ آنے کی شکایت کی تو کہنے لگیں..... ''بیگم صاحبہ میں نے خان صاحب غضنفر علی خاں کے یہاں نوکری کر لی ہے۔ کام تو کوئی خاص نہیں ہے بس گھر وہ ہے۔ پھر اتنی دور سے روز پیدل آوں بھی تو کیسے۔ ایک تو برقعہ اوڑھتے ہی گرمی سے دل پر چپے پڑنے لگتے ہیں، اس پر اتنی دُور کی چلائی۔ ورنہ میں تو جوگی کا سا پھیرا مارتی رہتی تھی۔''

''تم وہاں کیا کرتی ہو.....'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں بس روٹی ضرور پکاتی ہوں بہت ہوا تو جھاڑو لگالی۔ پکے فرش پر جھاڑو

دینا کون سا مشکل کام ہے، ہاں بچے کو لئے لئے ضرور پھرتی ہوں۔"

"بچے کو! کس کے بچے کو؟"

"وہ ہے نا اُن کا بھتیجا محمد عاقل، اسی کو گھر میں رکھ لیا ہے اُسی کے بچے کو۔ باقی کام اُس کی دلہن کرتی ہے، بے چاروں نے جوانی ایسے ہی گزار دی۔"

"ہاں بی بی! میں نے ایک دن چھیڑا تو کہنے لگے: بوا جب قدرت کو بیوی کا سُکھ ایک سال کے لئے ہی دینا پسند تھا تو میں اس پر راضی ہوں، مگر یہ بھی چاہتا ہوں کہ جب بڑھاپا آجائے گا تو اور بھی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ میں نے کہا میاں کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔ شادی تو آپ کو کر لینی ہی چاہئے تھی۔ اس وقت تو میری بات ٹال گئے مگر ایک دن خود ہی کہنے لگے: بوا! تمہاری بات کسی حد تک ٹھیک ہی ہے۔ مجھے شادی کر لینی چاہئے تھی۔ اب دل چاہتا ہے کہ جب اللہ نے دیا ہے تو کیوں نہ اس کے گھر کی زیارت کر لوں، مگر اکیلے جانا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ سفر میں ایک سے دو بھلے مگر کوئی کتنا بھی قریب ہوا اپنا پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے..... میں نے کہا میاں میں نے تو پہلے ہی یہی بات کہی تھی۔ بس چپ ہو گئے۔ پھر کچھ نہیں کہا۔ لاؤ بی بی پان کی کتر تو کھلا دو۔"

بیگم صاحبہ پان بنانے لگیں تو امجدی بوا نے اپنے منہ کو اُن کے قریب لا کر کہا..... "بی بی بُرا مت ماننا اگر تم کہو تو میں میاں سے بات کروں۔"

اور بیگم صاحبہ حیران رہ گئیں..... "بوا کیسی باتیں کرتی ہو کہاں غضنفر علی خاں اور کہاں نسیم بی"۔

"مگر بی بی! میں نے کہا بُرا مت ماننا۔ نسیم بی بی اب پندرہ سولہ برس کی لڑکی بھی نہیں ہیں۔ اللہ رکھے تیس سے اوپر ہی ہوں گی۔ ویسے اپنی اولاد کو تو سبھی بچہ ہی سمجھتے ہیں۔ تم سوچ لو اور خوب سوچ لو۔ رشتے آنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اور نسیم بی کی عمر بھی اب ڈھلتی جا رہی ہے، میں نے خدا لگتی کہہ دی، نہ مجھے اُن سے کچھ مل جائے گا اور نہ تم سے اور نہ میں اس کی طمع رکھتی ہوں۔"

''مگر بوا اُن کی بیوی کو مرے ہوئے بھی بائیس سال ہو چکے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔
''ہاں اور کیا اتنے دن تو ہو ہی گئے ہوں گے.....وہ اس وقت ساٹھ کی لپیٹ میں ہوں گے۔ مگر بی بی کھائے پیئے سے بڑھاپا بھی بہت دیر سے آتا ہے۔ اس وقت بھی چالیس سال والوں سے کاٹھی اچھی ہے۔ یقین نہ آئے تو میاں سے پوچھ لینا اور بی بی مرد تو ساٹھا بھی پاٹھا ہوتا ہے۔'' امجدی بُوا نے وضاحت کی۔
''اچھا تو میں اُن سے ذکر کروں گی۔ تم پھر آنا۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔
امجدی بُوا تو چلی گئیں لیکن اپنی آنکھیں چھوڑ گئیں وہ گھنٹوں انہی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔ اپنے کندھوں پر رکھا ہوا نسیم بی کے وجود کا بوجھ.....نسیم بی کی ڈھلتی عمر.....غضنفر علی خاں کی نیک نامی اور دولت اور پھر اُنہیں امجدی بُوا کی ذات سراپا رحمت نظر آئی اور پھر جیسے اُنہیں لق و دق صحرا میں پانی کا چشمہ نظر آ گیا ہو۔ مگر شام کو جب انہوں نے خاں صاحب سے ذکر کیا تو وہ بہت خفا ہوئے۔
''امجدی بوا پاگل ہو گئی ہیں۔ غضنفر علی خاں میری عمر کے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔''
''لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے.....دو چار دن کہیں گے۔ ہماری بیٹی کو چین ہونا چاہئے۔ باتیں بنانے والے تو ہر حال میں بنائیں گے۔'' اور پھر انتہائی رازداری سے کہا..... ''غصہ سے کام نہ لو، ذرا سوچو نسیم اب اکتیس سال کی ہو رہی ہے لیکن چہرے سے چالیس کی لگتی ہے اب مجھے کسی کنوارے بالے کا رشتہ آتا تو نظر نہیں آتا۔ جس گھر سے بار بار رقعے واپس ہوتے ہیں وہاں لوگ واپس ہونے کے ڈر سے پھر بھیجتے ہی نہیں۔ کسے اپنی ذلت گوارا ہوتی ہے۔''

خاں صاحب نے ہاں ناں میں بھی کچھ نہیں کہا خاموشی سے حقہ کے کش لیتے رہے۔
بیگم صاحبہ نے کہا..... یہ کوئی باقاعدہ رشتہ نہیں ہے مگر امجدی بوا نے ذکر کیا تو میں نے آپ سے کہہ دیا۔ آخر بیٹی کو اس طرح بٹھائے رکھنے سے بھی تو ہمیں ہی گناہ ہو رہا ہے۔ پھر انتہائی رازداری سے بولیں..... ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے بیٹی بھی سیدھی سادی بے زبان دی

ہے ورنہ آج کل کی لڑکیاں پٹاخ پٹاخ منھ سے بولتی ہیں۔ گھر والوں کے ساتھ اُن کا رویّہ ہی ایسا ہو جاتا ہے کہ اونچا نیچا دیکھ کر اُنہیں رخصت کرنا پڑتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کوئی نیک بد ہو جائے تو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''مگر اس میں اپنی تربیت کو بھی تو دخل ہوتا ہے۔'' خان صاحب نے حقّے کی نَے منھ سے نکال کر کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے مگر بُرا وقت کبھی کہہ کر نہیں آتا۔ وہ کہاوت ہے نا..... بیٹی رہے تو آپ سے ورنہ نہ رہے سگے باپ سے۔ بس اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔''

نسیم بی واقعی صبر و رضا کا پیکر تھیں۔ اپنے کام سے کام رکھتیں۔ واجبی بات کرتیں۔ کسی بات پر برہم ہونا یا اختلافِ رائے کا اظہار کرنا تو شاید انہیں آتا ہی نہ تھا۔ خان صاحب نے خاندان والوں کے تئیں کچھ ایسا رویّہ رکھا تھا کہ سبھی مرعوب تھے۔ اُن کے سامنے کسی کو بات کرنے کی بھی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے رشتہ داروں کا اُن کے یہاں آنا جانا بھی برائے نام ہی تھا۔ بس پڑھنے والی لڑکیاں ضرور آتی تھیں جن میں بچّیاں بھی تھیں اور نوعمریں بھی، جو نسیم بی سے قرآن پڑھتی تھیں۔ نسیم بی کا جو وقت باورچی خانے، سلائی مشین اور جائے نماز سے بچ جاتا، وہ علّامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نزیر احمد کی کتابوں پر صرف ہو جاتا۔

جن لڑکیوں سے وہ کبھی بات چیت کر لیتی تھیں اُن سبھی کی یکے بعد دیگرے شادی ہو چکی تھی اور اب کبھی اُن میں سے کوئی آجاتی تو وہ خیر و عافیت سے زیادہ بات چیت نہیں کیا کرتیں۔ لیکن اب کچھ دنوں سے اُن میں یہ تبدیلی ضرور آگئی تھی کہ کوئی نو بیاہتا عورت آتی اور بیگم صاحبہ کے کریدنے پر اپنی ازدواجی زندگی کی آسائشوں کا ذکر کرتی تو اُن کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ حسرت و محرومی کا ملا جلا احساس اُبھرتا اور پھر کئی دن وہ گم صم رہتیں۔ اُن کا وجود اندر ہی اندر پگھلتا رہتا۔ اُن کی فطری سنجیدگی کسی کرب کا اظہار نہیں ہونے دیتی تھی۔

تیسرے دن امجدی بوا پھر آگئیں۔ اپنا بوتل نما سفید برقع اُتار کر ایک طرف رکھتے ہوئے وہ بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

''کہو امجدی بوا ٹھیک ہو؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

''مجھے کیا ہوگا بی بی..... جب تک قسمت میں ٹھوکریں کھانا لکھی ہیں کھا رہی ہوں۔''

''ٹھوکریں؟ شکر کرو خدا کا بُوا۔ تم سے بھی زیادہ بُرے حال میں لوگ ہوں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے مگر..... لاؤ پان کی کتر کھلا دو۔ رحمتی کے گھر سے ہوتی ہوئی آ رہی ہوں۔ اس کے بچے، اللہ اُنہیں سمجھے ویسے تو آسمان میں تھگلی لگا دیں مگر ماں جو کہے کیا مجال کہ سُن لیں۔ اس نے بھتیرا کہا کہ نانی چٹا منہ لئے بیٹھی ہیں۔ دس پیسے کے پان لا دے مگر بی ایک نے بھی اور دوسرے نے بھی ایک کان سے سُنا اور دوسرے سے اُڑا دیا۔

بیگم صاحبہ نے تھالی میں پان رکھ کر امجدی بُوا کے آگے تھالی سرکا دی۔ امجدی بوا بھی جہاں دیدہ عورت تھیں بولیں:

''بی بی آج تو پان ایسے دیا ہے جیسے سمدھیانے سے آئی ہوں۔''

بیگم صاحبہ کی عادت تھی پان امجدی بوا کی چٹکی میں پکڑا دیتیں اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر چھالیہ اور تمباکو رکھ دیتیں مگر امجدی بوا تھیں اُڑتی چڑیا کے پر گننے والی۔ فوراً تاڑ گئیں اور آمدم برسرِ مطلب، انہوں نے ذکر چھیڑ ہی دیا۔

''ہاں ذکر کیا تو تھا..... مگر تم تو بتاؤ ایسے ہی ڈھول میں لٹھ مارنے سے کیا فائدہ۔''

''کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں۔'' امجدی بوا آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے بولیں۔

''مطلب یہ کہ کوئی باقاعدہ رقعہ پرچہ تو ہے نہیں۔ تم نے بھی تذکرتاً کہا تھا۔ اب میں نے اُن سے ذکر کیا مگر وہ چپ رہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''ہاں ناں میں کوئی جواب نہیں دیا؟'' امجدی نے جاننا چاہا۔

''تم بھی کیسی مت کٹی باتیں کرتی ہو بوا۔ میں زیادہ اصرار کرتی بھی کیسے۔ جب تک یہ بات معلوم نہ ہو کہ تم غضنفر علی خاں کا رشتہ سنجیدگی سے لائی ہو۔ ایسے تو میں کرنے سے رہی کہ سوت نہ کپاس اور جلاہے سے لٹھم لٹھا۔'' بیگم صاحبہ نے امجدی بوا کو مزید کھولنے کے لئے وضاحت کی۔

امجدی بوا بیگم صاحبہ کے اور قریب آ گئیں اور انتہائی رازداری سے بولیں..... ''بی بی ! اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو میں نے اسی زبان سے بیسیوں رشتے کرا دیئے ہیں۔ میں کبھی ایسی بات زبان سے نہیں نکالتی کہ کل کو نظر نیچی ہو۔ میں نے دو باتوں ہی میں خان صاحب کا منشار سمجھ لیا تھا۔ یہ بال دھوپ میں سفید تھوڑی کیے ہیں۔ میں نے تمہاری، اور کی صحبت میں اُٹھ بیٹھ کر ہی سیکھا ہے۔'' پھر بیگم صاحبہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ ''میں نے آپ کے پاس سے جا کر شام کو خان صاحب سے ذکر چھیڑا..... پہلے تو ناں ناں کرتے رہے۔ پھر بولے ''تمہاری یہی خوشی ہے تو کرآؤ بات کسی سے۔ میں کیا سمجھتی نہیں ہوں کہ میری خوشی کے لئے کیوں کریں گے۔ میرے کندھے پر بندوق رکھ رہے ہیں۔ میں نے کہا میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں ایک ہے۔ حیرت سے بولے.....لڑکی؟ میں نے کہا ہاں لڑکی.....کنواری لڑکی.....ضد پکڑ گئے کہ بتادو کس کی لڑکی ہے؟ میں نے کہا ابھی میں نے بات چیت نہیں کی ہے کہ آپ کہیں تو بات کروں.....اور میں نے جب میاں جی کا نام بتایا تو اُچھل پڑے۔ بولے بوا کیسی باتیں کرتی ہو؟ خان صاحب تو ویسے ہی بہت سخت آدمی ہیں اگر انہوں نے انکار کر دیا تو اس میں ہماری بے عزتی ہے۔ کوئی شریف لڑکی جو غریب بھی ہو، مناسب ہے۔ میں نے کہا۔ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ امجدی جس بات کا بیڑا اُٹھا لیتی ہے اُسے وہ پورا کر کے ہی چھوڑتی ہے۔''

بیگم صاحبہ دیوار کے سہارے تکیہ سے کمر لگائے بُوا کے مکالمے سُن رہی تھیں..... ''اب بی بی زبان کو ہی رُقعہ پرچہ سمجھو۔ میں جمعہ کے دن آؤں گی.....اچھا اب میں جا رہی ہوں ہشتری کے گھر بھی جانا ہے اس کے بچے کو موتی جھلا نکل آئی ہے۔ کہے گی ماں نے خبر بھی نہیں لی۔'' امجد برقعہ پہن کر سلام کرتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھ گئیں۔

....

''کیا سو گئے آپ؟۔''

بیگم صاحبہ نے خان صاحب کا شانہ ہلا کر آہستہ سے کہا۔

''نہیں تو.....کیا بات ہے؟''

''آنکھیں کھولئے تو بتاؤں۔''

خان صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔''کوئی خاص بات۔؟''

''جی ہاں!وہ بھی سنبھل کر اُن کے قریب بیٹھ گئیں۔''آج امجدی بُو آئی تھیں اُسی سلسلہ میں۔میں نے رقعہ کی بات کہی تو کہنے لگیں۔بی بی میری زبان کو رقعہ سمجھو۔بس ہاں کہہ دو۔اس کے بعد تو مردوں میں بات ہو ہی جائے گی۔''

''تو پھر آپ نے ہاں کہہ دی؟۔''خان صاحب نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''توبہ توبہ! آپ تو بچّوں جیسی باتیں کرنے لگے۔کبھی میں نے کوئی کام آپ کی اجازت کے بغیر کیا ہے؟ یہ فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔''بیگم صاحبہ نے کہا۔

''بھئی بات کچھ حلق سے اُتر نہیں رہی ہے۔لوگ کیا کہیں گے۔''

''پھر وہی مرغی کی ایک ٹانگ، لوگ کیا کہیں گے۔لوگ کیا اب نہیں کہہ رہے ہیں؟''بیگم صاحبہ جھنجھلا گئیں اور خان صاحب کی بات کاٹ کر کہنے لگیں۔''خدا جانے آپ لوگوں سے کس قدر خوفزدہ رہتے ہیں؟''پھر نرم لہجے میں سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

''دیکھئے آپ لوگوں کو ذہن سے نکال کر سوچئے۔اپنا سکون اور اپنی بیٹی کا مستقبل دیکھئے۔آپ نسیم کے مزاج پر غور کیجئے.....سنجیدہ ہے، بردبار ہے دین پسند ہے۔غضنفر علی خاں بھی لونڈے لبارے نہیں ہیں۔دونوں میں خوب نباہ ہو جائے گا۔پھر وہ نسیم کو حج کرانے لے جائیں گے۔کیا یہ اُس کی خوش نصیبی نہ ہوگی؟''

اور نسیم بی نے ایک لمبی سانس لی جو دیر سے کھڑکی کے سوراخ سے کان لگائے کھڑی تھیں۔

''بیگم ہم بڑی شش و پنج میں ہیں۔ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ٹھیک ہے جیسا چاہو جواب دے دو۔''

''اگر آپ یہ اجازت بخوشی دیتے ہیں تو پھر میں''ہاں''کہہ دوں گی۔جوان بیٹی جتنی

جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اچھا ہی ہے۔ جوان بیٹی ماں باپ کے پیر کی بیڑی ہو جاتی ہے۔ اے اللہ تو اس فرض کو ادا کرا دے پھر ہم بھی تیرے گھر کی زیارت کو آئیں گے۔'' وہ اللہ سے دُعا مانگتے ہوئے اُٹھ گئیں۔

....

شادی کی تاریخ کچھ اتنی جلدی قریب آ گئی کہ پتہ ہی نہ چلا۔ زیادہ تر معاملات امجدی بوا کے ذریعہ ہی طے پائے تھے۔ بقول امجدی بوا کے وہ سرگاڑی پاؤں پہیہ ہو گئی تھیں لیکن تاریخ کے تعین کے لئے غضنفر علی خاں کے چند رشتہ دار اور دوست خان صاحب کے یہاں آئے تھے تیاری تقریباً دونوں طرف تھی۔ دولہا والوں کو تو ویسے بھی زیور اور جوڑوں کے علاوہ ایسے لمبے چوڑے انتظامات نہیں کرنے ہوتے ہیں جیسے کہ دلہن والوں کو، اور یہاں دلہن کے گھر میں پہلے سے سب کچھ تیار تھا۔

شادی کی تقریب اگر چہ سادا تھی مگر دونوں طرف کے سیکڑوں رشتہ دار اور دوست موجود تھے۔ خان صاحب کے یہاں اگر چہ باجا اور ڈھولک حرام سمجھی جاتی تھی، لیکن دلہن کو رسماً مائیوں تو بٹھایا ہی گیا تھا۔ اُن کے پاس کونے میں لڑکیاں بغیر ڈھولک کے ہی سہاگ اور فلمی گیت گاتی رہی تھیں۔

نکاح کے بعد نسیم بی کو دلہن بنایا جانے لگا۔ دولہا کو زنان خانے میں بھیجا گیا اگر چہ غضنفر علی خاں اس کے لئے تیار نہیں تھے لیکن اندر سے عورتوں کے بار بار اصرار پر جانا پڑا۔ وہ ایک کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ عورتیں اُن کی زیارت کرنے لگیں اور پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''اری بہن! دولہا تو بوڑھا ہے۔ کنپٹیوں کے پاس سارے بال سفید ہیں۔''

''تو دلہن کون سی ننھی ہیں۔ اگر وقت سے شادی ہو گئی ہوتی تو بیٹیاں بیاہ کے قابل ہوتیں۔''

''ارے خاں صاحب نے کیا دیکھ کر دیا ہے بیٹی کو۔''

''ہمیں کیا.....زیادہ چھاننے والے ایسے ہی کرکرا کھاتے ہیں۔''

''چہ، بے چاری کا نصیب پھوٹ گیا۔''

''دونوں پکّی عمر کے ہیں، نبھ جائے گی۔''

''بس یوں سمجھو ماں باپ نے اپنے سر سے بوجھ اُتارا ہے۔''

''نصیب سے کوئی خبردار نہیں ہے۔غریبوں کی لڑکیاں جلدی اُٹھ جاتی ہیں اور امیروں کی بیٹھی رہ جاتی ہیں۔''

''عمر کیا لائی ہے، دل کو چین ہونا چاہئے۔''

''اور کیا.....چیز پُرانی ہو جاتی ہے تو ایسے ہی اونے پونے داموں میں دے دی جاتی ہے۔''

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔نسیم بی کے کان بھلا بند تو تھے نہیں۔کچھ آوازیں انہوں نے بھی سُنیں اور وہ جواَب تک ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق تھیں، پگھل گئیں۔اور پھر دل پر ایسا دورہ پڑا کہ ہوش ہی نہ رہا.....سب اُن کی اس کیفیت کو دُلہنوں کے روایتی رونے دھونے سے تعبیر کر رہے تھے کسی کو کیا خبر تھی کہ اُن کے اندر کن احساسات کا لاوا پک رہا ہے وہ اپنے اندر کے کس احتجاج کو کچل رہی ہیں.....؟

دُلہن کو ہوش میں لانے کے جتن کیے جا رہے تھے۔کوئی منہ میں پانی ڈال رہا تھا تو کوئی عورت ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔بیگم صاحبہ گھبرا گھبرا کر اس کے چہرے کو ادھر اُدھر موڑتیں، گال پر ہاتھ رکھ کر کہتیں نسیم.....بیٹی نسیم آنکھیں کھولو.....مگر نسیم بی کو ہوش کہاں تھا۔ مردانے میں خبر گئی.....خان صاحب نے فوراً فیملی ڈاکٹر کو بُلایا مگر اس کے آنے سے قبل ہی نسیم بی کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی.....کہرام مچ گیا۔سب چیخ رہے تھے۔بین کر رہے تھے مگر نسیم بی سکون کی نیند سو رہی تھیں۔ ❁ ❁

اور مُراد بر آئی

جب اقبال احمد کی والدہ شمشیر علی خاں کے یہاں ان کی بیٹی سنجیدہ خانم کے لئے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر گئیں اور اس کا اظہار کیا تو گھر کی خواتین حیرت سے ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگیں۔ یہ ردِ عمل اقبال احمد کی والدہ کے لئے بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ تو بیٹے کے بار بار کے اصرار پر بہت ہمت جٹا کر آئی تھیں.....وہ اپنے اور شمشیر علی خاں کے خاندانی فرق کو پہلے سے ہی محسوس کرتی تھیں۔

شمشیر علی خاں کی شاندار کوٹھی میں تین خواتین تھیں.....ایک ان کی بیگم، دوسری بہو اور تیسری وہ بیٹی جس کا رشتہ لے کر اقبال احمد کی والدہ وارد ہوتی تھیں۔

سنجیدہ خانم تو وہاں سے فوراً کمرے میں چلی گئیں لیکن مہمان کے پاس ساس بہو رہ گئیں۔ بیگم شمشیر علی خاں نے ماحول کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا'' آج کل اقبال احمد کیا کر رہے ہیں؟۔''

''کسی کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ تنخواہ بھی تیس ہزار روپے ہے اور یہ ان کی کمپنی کا پتہ ہے۔ انھوں نے ایک وزیٹنگ کارڈ بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''ہمارے لئے اقبال احمد دیکھے بھالے ہیں۔ میں اس بات کا ذکر خان صاحب سے کردوں گی۔ فیصلہ تو انہی کو لینا ہے نا!''۔ بیگم شمشیر علی خاں نے کہا تو وہ بولیں ''بیشک!''۔ پھر

قدرے توقف کے بعد بولیں "بیٹی کے رشتے کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ خان صاحب جو فیصلہ لیں گے وہ یقیناً ٹھیک ہوگا۔"

اتنی دیر میں خادمہ نے دالان کے ایک گوشے میں بڑی ڈائننگ ٹیبل پر چائے کا انتظام کر دیا تھا۔ بیگم شمشیر علی خاں اپنی بہو اور مہمان خاتون کو لے کر وہاں پہنچ گئیں اور اقبال احمد کی والدہ تواضع کے بعد اپنے گھر آ گئیں اور بات آئی گئی ہو کر رہ گئی۔ جب ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تو انہیں یقین ہونے لگا کہ ان کے بیٹے کے لئے محلوں کے خواب دیکھنا سمجھداری نہیں ہے۔ وقت اور حالات کی تبدیلیوں کا اِن اَن پڑھ اور سیدھی سادی خاتون کو کہاں علم تھا۔ جو طبقاتی فرق برسوں پہلے ان کے ذہن میں قائم ہو چکا تھا وہ آج بھی قائم تھا۔ انھیں خانصاحب کے یہاں سے واپس آ کر اگر کچھ اطمینان حاصل ہوا تھا تو وہ یہی تھا کہ ان کے گھر کی خواتین نے ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھ کر محتاط انداز میں گفتگو اور مناسب تواضع کی تھی۔

بیگم صاحبہ نے جب خان صاحب سے اقبال احمد کی والدہ کے آنے کا ذکر کیا اور ایک وزیٹنگ کارڈ بھی دیا تو وہ بہت دیر تک سوچتے رہے اور پھر بڑی متانت سے کہا..... "بیگم! یہ بچہ سامنے کا پلا بڑھا ہے۔ شریف رہا ہے اور پڑھنے لکھنے کا شوقین بھی.....اور اس کارڈ میں لکھا ہے کہ اب انجینئر ہو گیا ہے۔ بظاہر تو کوئی بُرائی نہیں ہے لیکن وہ ہمارے یہاں طالبِ علمی کے زمانے میں آتا جاتا رہا ہے۔ ایک ہی کالج میں پڑھنے کی وجہ سے ہماری بیٹی سے بھی بے تکلفی رہی ہے۔ گو کہ اس بات کو پانچ چھ سال کا عرصہ گزر گیا ہے، مگر کسی کو پھر بھی بدگمانی کے اظہار کا موقع مل سکتا ہے.....اس سے قطع نظر حیثیتوں کا جو فرق ہے وہ اتنی جلدی مٹنے والا نہیں ہے۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان کبھی کبھی یہ فرق مٹ نہیں پاتا اور باہمی اختلاف کی صورت میں اذیت پہنچاتا ہے۔"

"ارے آپ بھی کہاں مفروضات پر غور کرنے لگے۔ میری نظر میں نا قبولیت کے یہ دونوں جواز بے اصل ہیں۔" بیگم صاحبہ بولیں "آپ یہ مت بھولئے دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ اس رشتے کے آنے کے بعد میں نے ایک ماں کی حیثیت سے سنجیدہ سے بھی

بات کی تھی۔ وہ بڑی متین اور میچور لڑکی ہے اس نے کہا..... ''امّی! اس معاملہ میں آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟ ابّو جو فیصلہ کریں گے مجھے وہ منظور ہوگا۔ البتہ آپ نے معلوم ہی کیا ہے تو پھر میں بتادوں وہ ایک سنجیدہ اور باوقار انسان ہیں، میں نے دورانِ تعلیم ایسا کچھ محسوس نہیں کیا جو اس رشتے کو رد کرنے کی بنیاد بن سکے..... وہ اُس شخص سے کہیں بہتر ہیں جسے ہم میں سے کسی نے پرکھا اور برتا نہیں ہے۔ ابو نے بھی کبھی سیریس ہو کر اس نظر سے نہیں دیکھا ہوگا۔ انکوائری کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا..... میرا خیال ہے دوستی اور دولت کی بنیاد پر کسی بہت کم پڑھے لکھے شخص کو ایک اہم مقصد کے لئے منتخب کر لینا ہرگز عقل مندی نہیں ہے..... ویسے والدین اولاد کے بدخواہ نہیں ہو سکتے آپ اور ابّو کا ہر فیصلہ بھی یقیناً میرے حق میں بہتر ہوگا اور اسے قبول کرنا میرا فرض۔''

خان صاحب سنجیدہ خانم کا جواب سُن کر حیران رہ گئے..... اتنا مکمل جواب ایسا جامع تقابلی تجزیہ..... وہ بھی ایک چوبیس پچیس سالہ لڑکی کے ذریعہ کیا ہوا.....!

خان صاحب شمشیر علی خاں کا شمار شہر کے وضعدار رئیسوں میں ہوتا تھا..... وہ ایکسپورٹ امپورٹ کے بزنس سے وابستہ تھے اور ان کی کئی فرموں میں ان کے پارٹنر اور دوست محمد اشرف صاحب تھے جو پڑوسی ضلع میں رہتے تھے۔ اشرف صاحب نے سنجیدہ خانم پر برسوں پہلے اپنا حق جتا دیا تھا جس پر خان صاحب مسکرا کر رہ گئے تھے۔

''بیگم ہم اشرف سے بہت پہلے وعدہ کر چکے ہیں۔''

''مگر وہ وعدہ برسوں پہلے کا ہے۔ حالات بدل چکے ہیں۔ اب بچّے جوان ہیں۔ ہمارے وعدے کی بھینٹ وہ کیوں چڑھیں..... آخر اُن کی اپنی خواہشات اور پسند و ناپسند کے معیارات بھی تو ہو سکتے ہیں..... اور کیا ضروری ہے کہ وہ اب بھی اپنے قول پر قائم ہوں۔''

''ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے''..... اور پھر بات آئی گئی ہو کر رہ گئی۔

جب بیٹی جوان ہو جائے تو والدین کی فکر مندی فطری بات ہے۔ شمشیر علی خاں کو

کاروباری مصروفیات کے باوجود رہ رہ کر بیٹی کا خیال آجاتا۔آج جب وہ دہلی سے لوٹ رہے تھے تو اقبال احمد کا خیال آ گیا۔سوچا کیا خبر یہ صاحب بھی ویسے ہوں یا نہ ہوں جیسا ان کا ماضی رہا ہے اس لئے گاڑی نوئیڈا کی سمت مڑوادی.....بیگم نے جو وزیٹنگ کارڈ دیا تھا اس میں نوئیڈا کا پتہ تھا۔انھوں نے ڈرائیور سے نوئیڈا چلنے کو کہا۔سیکٹر نمبر بتایا اور جلد ہی کنسٹرکشن کمپنی کے آفس میں پہنچ گئے۔

''ارے خان صاحب آپ! خیریت تو ہے؟''۔

وہ اُن سے مصافحہ کرتے ہوئے آفس میں لے گئے۔

''یہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ بھی یہاں ہیں اور غالباً منیجر ہیں.....ہمارا کام فون سے بات کر کے ہی ہو جاتا''۔خان صاحب نے کہا تو خالد صاحب نے کہا''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی شخصیت کی تشریف آوری ہوئی ہے۔''

''بھئی خالد میاں ! یہ اقبال احمد آپ کے یہاں انجینیئر ہیں ؟''۔ انہوں نے کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہیں۔اس وقت بھی سائٹ پر ہیں.....کیا بات؟ بلواؤں انھیں؟''۔

خالد میاں نے مختصر جملوں میں اپنی بات کہہ کر اُن کی رائے جاننا چاہی۔

''نہیں ، بلانے کی ضرورت نہیں ہے .....ہم ان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے کہ کیسے نوجوان ہیں۔؟''

خالد صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا.....''میں سمجھ گیا ، خانصاحب ! اقبال احمد بہت دیندار، ایماندار اور شریف نوجوان ہیں۔ذہین اور محنتی ہیں۔ڈیڑھ سال میں ہی کمپنی نے دس ہزار سے پینتیس ہزار تنخواہ پر پہنچادیا ہے۔خان صاحب ! میرے دونوں بیٹے ہی ہیں اگر ایک بھی بیٹی ہوتی تو میں اس کی شادی اقبال احمد سے کرنے کی کوشش کرتا۔''

شمشیر علی خاں وہاں سے رخصت ہوئے تو ایک بوجھ لئے ہوئے .....کشمکش میں مبتلا.....کیا کریں کیا نہ کریں؟ ایک طرف ایک لائق نوجوان اور دوسری طرف دوستی اور دیرینہ

وعدہ.....وہ راستہ بھر اسی اُدھیڑ بُن میں رہے کہ اس مسئلہ کو کیسے حل کریں۔ بیٹی کے کہے ہوئے الفاظ اُن کی نظر میں بہت معنی رکھتے تھے پھر ان کی تائید خالد میاں کی تصدیق سے ہوگئی تھی..... ٹی ایم یو سے آگے بڑھتے ہی اچانک انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ اشرف صاحب سے ملتے چلے جائیں بات واضح ہوجائے گی۔ انھوں نے ڈرائیور سے کہا.....''اشرف صاحب کے یہاں چلنا ہے۔''اشارے کی دیر تھی کہ ڈرائیور نے گاڑی پیلی کوٹھی کی سمت موڑ دی.....

گفتگو کے دوران اشرف صاحب نے پوچھا.....''آج اچانک اور اس وقت کیسے؟''

خانصاحب تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں گئے تھے۔ بتانے لگے .....''بھائی اشرف صاحب سنجیدہ اب بڑی ہوگئی ہے۔ ایک رشتہ آیا۔ بڑا مناسب ..... بلکہ بہت اچھا۔ اسی کی معلومات کر کے نوئیڈا سے آرہا ہوں۔ انجینئر ہے اور بڑا لائق۔''

شمشیر علی خاں نے اتنا کہہ کر اشرف صاحب کی آنکھوں میں جھانکا مگر وہاں دُور تک سناٹا تھا۔ زبان خاموش تھی۔

''ارے بھائی کہاں کھو گئے.....اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی کیا؟۔''

''بھائی شمشیر خاں میں ماضی میں کھو گیا تھا.....میں وہ دن یاد کر رہا تھا جب ہم نے باہم کوئی پیمان کیا تھا۔ میں حیرت سے اُن خان صاحب کو دیکھ رہا ہوں جن کی زبان سے کیا ہوا وعدہ میں نے ہمیشہ وفا ہوتے ہوئے پایا ہے۔''

اور خان صاحب نے ظاہری ہنسی کے ساتھ کہا.....''ارے ہاں ہم تو بھول ہی گئے تھے۔ اچھا ہوا یاد دلا دیا آپ نے۔ تو پھر ہم یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنے اس قول پر قائم ہیں۔''

''بالکل.....اور بہت جلد ہم باقاعدہ اپنی بیٹی کو مانگنے آپ کے دولت کدے پر آئیں گے۔''

خاں صاحب کی الجھن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ البتہ مشرف کو دیکھ کر انھیں محسوس ہوا کہ وہ بگڑا ہوا سا نوجوان ہے۔ وہ اس کی فرم کے آفس میں قصداً گئے تھے جہاں انھوں نے تقریباً سارا اسٹاف نوجوان خواتین پر مشتمل پایا.....اور یہ کسی نوجوان کے مزاج اور ذوق کو سمجھنے کے

لئے کافی تھا.....لیکن کچھ گمان اور اندیشے قطع تعلق کے لئے مستند جواز تو نہیں ہو سکتے.....بہر حال خان صاحب وہاں سے رخصت ہو کر گھر اس طرح پہنچے کہ جیسے کوئی جواری اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ہار آیا ہو۔

خان صاحب چند روز فکر مند رہے پھر کاروباری مصروفیات میں لگ گئے۔ وہ اس مسئلہ کو ابھی کچھ عرصہ تک مؤخر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ خالی الذہن ہو کر اس کا حل نکالنا چاہتے تھے.....ایک تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ مشرف خود اُن کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر دے..... یا پھر اُس کے کردار کی کچھ ایسی کمزوریاں سامنے آئیں جو اس رشتے سے انکار کا سبب بن سکیں.....بہر حال خان صاحب خان صاحب تھے.....سمجھدار، مدبّر اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے۔

جب اشرف صاحب نے بیٹے کے سامنے خان صاحب کی بیٹی کا ذکر کیا اور اپنا قول دہرایا تو پہلے تو بڑا دل برداشتہ ہوا اور کہا "پاپا اس زمانے میں کوئی ایسا کرتا ہے جیسا آپ نے کیا .....ایک اجنبی لڑکی .....ایک سخت دقیانوسی ماحول کی لڑکی.....آپ کے فیصلے کو میں زندگی بھر کیسے بھر سکوں گا۔ آپ انکل سے باتوں باتوں میں یہ سلسلہ ختم کر دیجئے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر کیا ضروری ہے کہ شادی کی ہی جائے....."

"زیادہ بیہودگی مت کیجئے جائیے اپنا کام دیکھئے۔" اشرف صاحب نے بیٹے کے جواب کو گستاخی پر محمول کیا۔ وہ وہاں سے چلا تو گیا مگر ماں سے کہا "میں کسی قیمت پر ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا جس کی شکل وصورت میں مجھے کوئی خاص کشش محسوس نہ ہوتی ہو..... عادات واطوار تو بعد کی چیزیں ہیں.....غرض یہ کہ اشرف صاحب کے گھر اس تعلق سے جو تنازعہ شروع ہوا اُس نے کئی ماہ نگل لئے اور پھر ایک دن اشرف صاحب نے انگیجمنٹ کی رسم ادائیگی کے لئے خواتین اور چند اعزہ کے آنے کا ذکر کیا تو خان صاحب نے کہا" بھائی یہ سب باتیں فضول کی ہیں کیسی انگیجمنٹ؟ آپ مجھے تاریخ بتایئے.....برات لایئے اور اپنی امانت کو

لے جایئے .....اور اس طرح چار پانچ ماہ میں ہی سنجیدہ خانم اور مشرف کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

وہ دو تین ماہ تذبذب کا شکار رہے اور پھر ایک دن خدا جانے کیا ہوا کہ ان کے آفس میں دو خواتین آئیں اور خان صاحب کو اطمینانِ قلب کے لئے تعویذ دے گئیں.....ایک دن شمشیر علی خاں نے اشرف صاحب اور ان کے چند اعزہ کو بُلا کر شادی کی تاریخ بھی طے کر دی۔

سنجیدہ خانم کی حالت ان دنوں دیکھتے ہی بنتی تھی ..... ''گم سم''.....اُداس.....اور خوفزدہ جیسی ۔ اقبال احمد جیسے نوجوان کا وہ محتاط جملہ کہ ''سنجیدہ ! مجھے تمہارا ساتھ زندگی بھر کے لئے مل جائے تو زندگی جنت بن جائے ۔'' رہ رہ کر یاد آتا جس کے جواب میں سنجیدہ خانم نے کہا تھا کہ ''ہاں اگر ایسا ہوا تو مجھے بھی خوشی ہوگی.....مگر ابو کی مرضی کے بغیر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو.....میں جب خود کو اس درخواست کا اہل بنالوں گا تو یہ کام یقیناً کروں گا۔''

یہ تھا دونوں کے درمیان کا پاکیزہ اظہارِ محبت یا اظہارِ رائے جس پر پانچ سال بعد اقبال احمد نے اپنی والدہ کے ذریعہ ایفائے وعدہ کیا تھا۔

دلہن کے جوڑے اور پنہونی خریدی جارہی تھی ۔ یہ کام بیگم صاحبہ اور بھابھی کر رہی تھیں ۔ سنجیدہ خانم تو ان کاموں سے لاتعلق جیسی تھیں ۔ اُنھیں نہ کوئی خوشی تھی اور امنگ ۔ سامان جہیز آرہا تھا.....اور پھر شادی کا دن بھی آ گیا۔

کوٹھی کے وسیع لان میں شامیانے لگا کر الگ الگ پنڈال قائم کئے گئے تھے ۔ ایک حصہ نکاح کی تقریب کے لئے تھا۔ دوسرا مہمانوں کے طعام کے لئے اور تیسرے حصے میں سامانِ جہیز قرینے سے سجایا گیا تھا.....کوئی ایسی ضروری اور قیمتی چیز نہیں تھی جسے خانصاحب نے اپنی بیٹی کے لئے اس فہرست میں شامل نہ کیا ہو۔

وقتِ مقررہ پر برات آ گئی۔شایانِ شان استقبال ہوا۔ایک تو کوٹھی اور اس کے لان خوبصورت تھے ہی، پنڈالوں میں مزید سجاوٹ کرائی گئی تھی۔ اشرف صاحب بارات کے استقبال، معیاری اور لذیذ کھانوں اور پنڈال میں سجے قیمتی جہیز سے پھولے نہیں سمار ہے تھے۔ان کے ساتھ آئے عزیز بھی خوش تھے.....اس ساری تقریب میں اگر کوئی خوش نہیں تھا تو وہ سنجیدہ خانم تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ انھیں مائیوں تک نہیں بٹھایا گیا جب کہ ہرلڑکی کوار مان ہوتا ہے۔بیگم صاحبہ نے خانصاحب سے وجہ بھی جاننا چاہی تو وہ بولے''بس جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو.....میں بھی سنجیدہ کا باپ ہوں۔''اس لئے بیگم صاحبہ بھی پژمردہ سی تھیں.....اگر خواتین کی اس محفل میں کوئی دلہن جیسی لگ رہی تھی تو وہ مہمان آئی ہوئی ایک خاتون عروسہ خانم تھی۔سب کی توجہ اس کی جانب تھی ایسا لگتا تھا کہ آج کل میں ہی اُس کی شادی ہوئی ہو۔

نکاح کا وقت قریب آرہا تھا کہ خان صاحب اشرف صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ اپنے آفس میں لائے۔اسے اندر سے بند کیا اور ایک کاغذ اشرف صاحب کو دیتے ہوئے کہا''آپ جس صاحبزادے کو میری بیٹی سے بیاہنے کے لئے لائے ہیں یہ انہی کا کارنامہ ہے''.....اور پھر کئی فوٹوگراف بھی پیش کئے۔اشرف صاحب غصہ، حیرت اور شرم کے ملے جلے جذبات سے تھر تھر کانپنے لگے۔

شمشیر علی خاں نے ان کے سامنے کرسی کرتے ہوئے ان کے دونوں کندھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔''اشرف !غصہ اور جذباتی ہونے کا یہ وقت نہیں ہے۔ ہمارے تھوپے ہوئے رشتے کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ پائیدار اور خوش آئند ہو سکتا ہے۔وقت بدل گیا ہے۔مشرف اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔تمہاری ضد کے آگے جب اس کی نہ چلی تو اس اقدام پر مجبور ہوا۔ ہم کیوں نہ اس کورٹ میرج کو مذہبی اور سماجی مضبوطی عطا کر دیں اسی میں تمہاری عزت ہے کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہ جاؤ۔ یہ سمجھو میں اپنی دوسری بیٹی رخصت کر رہا ہوں .....آؤ مسکراتے ہوئے باہر نکلیں.....''

قاضی صاحب نکاح خوانی کے لئے موجود تھے۔خانصاحب نے ان کے پاس بیٹھ کر

نکاح نامہ کی خانہ پُری کرائی اور قاضی صاحب نے جب خطبہٗ نکاح کے بعد دہرایا کہ عروسہ خانم بنت محمد رضوان احمد مرحوم ساکن میرٹھ کو آپ کے ساتھ نکاح کے لئے بعوض ایک لاکھ روپے سکّہٗ رائج الوقت ان وکیل صاحب نے دیا آپ کو قبول ہے؟ تو مشرف ہکا بکا رہ گئے۔ باپ کی جانب خوفزدہ ہوکر دیکھا، انھوں نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا.....اور مشرف نے اس انداز میں ''قبول ہے'' کہا جیسے کسی کے سر پر تلوار تنی ہو اور اسے بریانی کھانے کو کہا جا رہا ہو.....

''مبارک ہو..... بھائی اشرف صاحب! آج ہم دوست اور پارٹنر سے عزیز بھی ہو گئے اور اشرف صاحب نے بھی خجالت اور مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ تائید کی.....خاں صاحب نے قاضی صاحب کے سامنے سے مائک اُٹھا کر کہا.....''میں اس سے پہلے کہ اپنے تمام مہمانوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں، ایک اعلان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔'' سب لوگ خاں صاحب کی جانب متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا.....''میری ایک بیٹی اور بھی ہے.....سنجیدہ خانم.....میں اس کی شادی کے لئے ایک انتہائی نیک، لائق اور اچھے نوجوان اقبال احمد کو منتخب کرتا ہوں''.....اقبال احمد اگلی صف میں ہی موجود تھے خاں صاحب نے انھیں اپنے پاس بلا کر کھڑا کیا اور کہا ''یہ سول انجینئر ہیں، تعمیرات کی ایک اچھی فرم سے وابستہ ہیں''.....سب لوگ خان صاحب کو دوہری مبارکباد دینے لگے۔

خان صاحب زنان خانہ کے دروازے میں آئے اور بیگم صاحبہ سے کہا ''وہ سامنے دلہن ہے۔ آپ دلہن کی رخصتی کی تیاری کیجئے۔'' اور بیگم صاحبہ جو ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھیں بولیں ''ارے یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ سب کچھ فلموں جیسا لگ رہا ہے؟''۔ اور وہ مسکراتے ہوئے بولے ''جو ہمیں کرنا چاہئے تھا وہی کیا.....غلط تو نہیں کیا نا!۔''

سنجیدہ خانم اس وقت واقعی جذباتی ہو رہی تھی.....ایک دم امّی کے پیچھے سے آگے آکر ابّو سے لپٹ گئی.....''میرے پیارے ابّو'' کہہ کر اندر اُٹھتے ہوئے طوفان کی شدّت سے یا پھر شدید مسرّت سے رو پڑی۔

اور خان صاحب نے بیٹی کو الگ کرتے ہوئے کہا..... ''یہ وقت اس کام کا نہیں ہے۔ اپنے بچّوں کی خوشیوں کے لئے ماں باپ وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو اُن کے لئے کرنا ممکن ہوتا ہے۔ میں نے بھی تمہارے حال اور مستقبل کو خوش دیکھنا چاہا ہے..... ویسے تو دلہن تیار ہوکر ہی آئی ہے پھر بھی اسے دیکھو اور شاندار طریقے سے رخصت کرو''..... اور جب عروسہ خانم رخصت ہورہی تھی تو خان صاحب جیسا سخت اور اعصاب کا مضبوط انسان بھی پلکوں پر ٹھہرے آنسو رخساروں پر بہنے سے نہ روک سکا تھا۔

❁ ❁ ❁

جُھک گیا آسمان

جمعہ خاں حیران تھے اور یہ بات سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ خان صاحب وجاہت اللہ خاں کے رویّے میں یہ تبدیلی اچانک کیوں اور کیسے آ گئی ہے کہ روک کر حال چال پوچھ لیتے ہیں اور دو چار باتیں اِدھر اُدھر کی بھی کر لیتے ہیں..... کیا وہ ایک غمزدہ خاندان سے ہمدردی کے اظہار کے طور پر ایسا کر رہے ہیں؟ ممکن ہے یہی وجہ ہو۔ وہ پہلی بار ندیم کی بیوی کے جنازے کے ساتھ قبرستان تک بھی گئے تھے، ورنہ وہ عموماً محل سے باہر نکل کر چوک میں نمازِ جنازہ میں شریک ہوتے اور واپس محل میں چلے جاتے۔ اُس دن انھوں نے نہ صرف ندیم کی ڈھارس بندھائی تھی بلکہ اس کے دونوں کمسن بچّوں کو گود میں بٹھا کر پیار کیا تھا۔ خان صاحب کے اس مشفقانہ رویّے نے جمعہ خاں کے کئی برس پہلے کے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا..... وہ زخم جن پر وقت کا کھرنڈ بھلے ہی جم گیا ہو لیکن جمعہ خاں حسّاس طبیعت کے انسان تھے، جب کبھی الفاظ کے تیر و نشتر انہیں یاد آ جاتے تو تادیر اُن میں ٹیس محسوس کرتے تھے۔

خان صاحب وجاہت اللہ خاں کا شمار خاندانی رئیسوں میں ہوتا تھا۔ کئی ایکڑ کاشت کی زمین، باغات اور ایک دو منزلہ پختہ مکان، جو اہل محلّہ میں 'محل' کے نام سے معروف تھا، اُن کی ملکیت میں تھا۔ ہر کام کے لئے نوکر چاکر تھے۔ محلّے والے اُن کی بے حد عزت کرتے۔ اُن کا کہنا مانتے اور اُن سے مرعوب بھی رہتے۔ خان صاحب کی نشست و برخاست معززینِ شہر

کے ساتھ تھی۔ آئے دن بڑے لوگ اور سرکاری افسران اُن کے یہاں بھی آتے رہتے۔ محلّے کے بچے اور بڑے بھی بڑے اشتیاق سے اُن کی کاروں کو دیکھتے، چھوتے اور اپنے آس پاس انہیں دیکھ کر فخر محسوس کرتے۔ الیکشن قریب آتا تو خان صاحب کے ڈرائنگ روم اور گلی کی رونق بڑھ جاتی۔ سیاسی اُمیدوار اُن کی حمایت کے طالب ہوتے..... اور خان صاحب کا اشارہ جس طرف ہوتا بستی کے لوگ اُسی کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ چھوٹے چھوٹے آپسی تنازعات و دیگر معاملات میں وہ کوئی فیصلہ کر دیتے تو پھر سب کو احتراماً اسے تسلیم کرنا پڑتا۔ اگر کبھی کسی کو ڈانٹ بھی دیتے تو وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی جرأت بھی نہیں کر پاتا۔ خان صاحب ایک سرپرست کی طرح اُن کے مسائل اور ضرورتوں پر نظر رکھتے تھے۔ آس پاس کے کسی لڑکے کی شادی ہوتی تو سہرا باندھ کر برات رخصت ہونے سے قبل وہ خان صاحب سے سر پر ہاتھ رکھوانے ضرور آتا۔ اور وہ اُسے دُعائیں اور لفافہ میں ''سلامی'' ضرور دیتے۔

پھر وقت کروٹ بدلنے لگا۔ نئی نسل میں جہاں تعلیم عام ہونے لگی وہیں اخلاقی قدروں میں بھی زبردست تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ عوام میں سیاسی شعور بیدار ہونے لگا۔ خواص بالخصوص سیاسی ٹھیکے داروں کی قدر و قیمت گھٹنے لگی۔ اس تبدیلی سے خان صاحب کی اہمیت اور وقار بھی متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے بیٹے صباحت اللہ خاں کی شادی بڑی شان سے ایک معزز گھرانے میں کی لیکن صباحت چند ماہ میں اپنی بیوی کو لے کر کسی بڑے شہر میں رہائش پذیر ہوگیا۔ خان صاحب اُس کے نکمّے پن اور شاہ خرچیوں سے پہلے ہی پریشان تھے۔ سوچا تھا شادی کے بعد ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر آئے گا تو بدل جائے گا..... مگر اب تو پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا۔ وہ اپنی فضول خرچیوں کے لئے بضد ہوکر جائدادیں فروخت کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ وجاہت اللہ خاں بیٹے کے گستاخانہ طرزِ تکلم عاقبت نااندیشانہ اور باغیانہ رویّے اور اپنی سیاسی وسماجی اہمیت کے کم ہوتے گراف کو محسوس کرتے ہوئے پہلے جیسے سخت اور بے لچک خان صاحب نہیں رہے تھے اور اس کا اظہار اُن کے رویّے سے بھی ہو رہا تھا..... مثلاً

ایک دن وجاہت اللہ خاں نے جمعہ خاں سے کہا..... ''بھئی جمعہ! ایک ہی گلی میں رہتے

ہوئے تم اس قدر دُور رہتے ہو کہ اگر میں اخبار پڑھنے کے لئے ڈرائنگ روم کا دروازہ اور کھڑکیاں کھول کر نہ بیٹھوں تو تمہاری صورت بھی برسوں نظر نہ آئے۔'' اور جمعہ خاں نے روایتی سنجیدگی سے جواب دیا: ''خاں صاحب! اب گھومنے پھرنے کی عمر کہاں رہ گئی ہے..... کہاں بیٹھوں کس سے بات کروں..... یہ کام تو نوعمروں اور نوجوانوں کے ہوتے ہیں۔ اللہ پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت پڑھوا دیتا ہے..... بس اب تو گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر، باجماعت نماز پڑھنے کا ایک سماجی فائدہ یہ بھی ہے کہ گلی محلّے کے لوگوں کے حالات سے واقفیت رہتی ہے۔''

''ہاں یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو.....'' خاں صاحب نے کہا اور پھر جمعہ خاں نے دیکھا کہ اگلے ہی وقت وہ نماز کے لئے مسجد میں آگئے اور پھر یہی اُن کا معمول بھی بن گیا۔

جمعہ خاں اپنے بڑے بیٹے ندیم سے بہت خوش تھے۔ وہ سلیقہ مند، بااخلاق اور بڑوں کا احترام کرنے والا نوجوان تھا۔ جمعہ خاں کو خدا جانے کیا سوجھی کہ ایک دن نماز سے لوٹتے ہوئے وجاہت اللہ خاں کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ خان صاحب نے اخبار میز پر رکھ دیا اور اُن کی جانب متوجہ ہو گئے..... ''بچے ٹھیک ٹھاک ہیں۔؟''

''اللہ کا شکر ہے خاں صاحب۔ دونوں چھوٹے سعودی عرب میں خوب کما رہے ہیں۔ البتہ بڑا لڑکا ندیم پڑھ رہا ہے۔ بڑے والے کالج میں ہے وہ۔ کہتا ہے بس ایک ڈیڑھ سال رہ گیا ہے، تعلیم پوری ہوتے ہی انجینئر بن جائے گا اور بہت اچھی نوکری مل جائے گی..... سچ پوچھئے تو سب سے لائق وہی ہے۔''

''تم بڑے خوش نصیب ہو جمعہ، جو فرمانبردار اولادیں ملی ہیں۔'' خان صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ہمارے بیٹے تو بربادی کی راہ پر چل رہے ہیں۔ ہم تو اتنے دل برداشتہ ہیں کہ یہ سوچتے ہیں اگر اللہ نے صباحت کی جگہ ایک بیٹی اور دیدی ہوتی تو ہمیں ایسی روحانی تکلیف تو نہ ہوتی جو آج ہم برداشت کر رہے ہیں.....'' سننے والا ملا تو خان صاحب اپنے اندر کا کرب چھپا نہیں سکے۔

جمعہ خاں نے وجاہت اللہ خاں کے قدرے نزدیک ہوتے ہوئے کہا....."ماشاء اللہ نسیم بی بی بٹیا اب بڑی ہوگئی ہیں، اگر اُن کے لئے ندیم....."

"کیا بک رہے ہو جمعہ!" خان صاحب نے بات پوری ہونے سے قبل ہی ڈانٹ دیا۔ "تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا۔" اُن کے چہرے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ جمعہ خاں اُن کے تیور دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ "کہیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کرتا ہے۔" جمعہ خاں نہایت متحمل مزاج انسان تھے۔ دانتوں میں انگلی دبائے مایوسی اور خجالت سے الفاظ کے تیر سہتے رہے اور کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"معاف کرنا خان صاحب! میں نے آپ کو تکلیف پہنچائی۔ معذرت خواہ ہوں۔"

"اور سنو" خان صاحب نے جمعہ خاں کو مخاطب کیا۔ وہ مڑ کر اُن کی جانب متوجہ ہوئے....."وہ دیکھو" خان صاحب نے اُنگلی کے اشارے سے کہا" آسمان اور زمین ملتے دکھائی دے رہے ہیں مگر یہ نظر کا دھوکا ہے.....آسمان اور زمین کبھی نہیں ملتے۔"

مگر جمعہ خاں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا.....اور پھر برسوں وجاہت اللہ خاں کے الفاظ نشتر کی طرح اُن کے ذہن و دل میں چبھتے رہے.....مگر بڑے ظرف والے انسان تھے، اس واقعہ کا ذکر نہ تو کبھی اپنے کسی بیٹے سے کیا اور نہ ہی کسی اور سے۔

آٹھ دس سال گزر گئے۔ وقت کے جھولے کے جس ہنڈولے میں خان صاحب سوار تھے.....وہ بلندی سے اب نیچے کی طرف آرہا تھا۔ بیگم صاحبہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ بہو بیٹے پہلے ہی داغ مفارقت دے کر بے راہ روی کی ڈگر پر نکل گئے تھے۔ نوکر چاکر بھی کم ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے خان صاحب اور نسیم بی بی کو ضرورت ہی کتنے خدمت گاروں کی تھی۔ وہ تو سارا کام خود ہی کر لیتی تھیں۔ خان صاحب کو اگر کوئی فکر تھی تو وہ نسیم بی بی کی تھی۔ وہ انھیں اس اُجڑے محل میں یک و تنہا چھوڑ کر دنیا سے نہیں جانا چاہتے تھے۔ جو رشتے اب سے آٹھ دس سال پہلے تک آئے وہ اُن کے معیار کے نہیں تھے۔ پھر جب رشتوں کی آمد کا سلسلہ تھما تو آٹھ دس

سال اُس میں گزر گئے.....آخر ۳۵۔۳۶ سال کی عمر، کسی لڑکی کی جوانی کے زوال کا آغاز ہوتا ہے۔اب نسیم بی بی کے خدوخال سے بھی ایسا ہی ظاہر ہونے لگا تھا۔وہ باپ کی انا اور تکبّر کی بھینٹ چڑھ رہی تھیں۔خاں صاحب اس تعلق سے گھنٹوں سوچتے.....پھر اُنھیں دور تک پھیلی تاریکی میں روشنی کی مدھم سی کرن نظر آئی،انھوں نے اپنی انا،خودداری اور برتری کے احساس کو بیٹی کے مستقبل پر قربان کرنے کا مشکل فیصلہ کرلیا.....انہوں نے حالات سے بادلِ ناخواستہ سمجھوتا کرنا قبول کرلیا۔

ایک دن خان صاحب جمعہ خاں کے گھر پہنچ گئے۔نوتعمیر شدہ رنگ وروغن کیا مکان خان صاحب کے محل کو جیسے منہ چڑا رہا ہو.....خان صاحب کے ساتھ پھلوں سے بھرا بیگ بھی تھا۔ جمعہ خاں حیرت زدہ رہ گئے.....''ارے خان صاحب آپ!اور یہ پھل کس لئے؟'' اُنھوں نے تھیلے سے جھانکتے پھلوں کو دیکھ کر اشارہ کیا۔

''جمعہ خاں ! کیا دروازے پر کھڑے ہوکر ہی سارے سوال پوچھ لو گے؟'' خان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جمعہ خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ڈرائنگ روم کھول کر اُنھیں بٹھایا۔

''لو یہ بچّوں کے لئے ہیں....ندیم خاں کے بچّوں کے لئے۔''

خان صاحب کی محبت اور بچّوں کے لئے یہ شفقت دیکھ کر جمعہ خاں کو جہاں مسرت ہوئی وہیں فخر بھی محسوس ہوا۔وہ تو پہلے ہی خان صاحب کی کرم فرمائیوں پر حیران تھے،اُن کے اس طرزِ عمل سے احساسِ ممنونیت اور بڑھ گیا.....ندیم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور نہایت احترام سے سلام علیک کر کے بیٹھ گیا۔خان صاحب نے نہ صرف اس کی لائق مندی کی تعریف کی بلکہ اُس کی نوجوان بیوی کے انتقال اور اس کے نتیجے میں پیش آمدہ آزمائشوں کا ذکر بڑی دلجوئی سے کر کے ماحول کو سوگوار بنا دیا۔ جمعہ خاں نے آنکھوں سے نمی صاف کرتے ہوئے بتایا۔

''میں بہت جلد ندیم کا نکاحِ ثانی کرانے کی فکر میں ہوں۔اس سلسلہ میں مناسب عمر کی لڑکی یا پھر کسی مطلقہ کی تلاش میں خاندان کی عورتیں کوشاں ہیں۔'' اس دوران ندیم ڈرائنگ روم سے

جا چکا تھا۔ خان صاحب سخت آزمائش میں مبتلا تھے۔ موضوع وہی تھا جس کے تحت اُنھیں بات کرنا تھی..... مگر آج الفاظ خاں صاحب کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ جب دل اور دماغ میں یگانگت نہ ہو تو زبان کی حالت کسی خوفزدہ بچے جیسی ہوتی ہے وہ کہتا کچھ ہے اور نکلتا کچھ ہے۔ آج اُن کی انا، اُن کا تکبر اور بڑا پن سماجی حالات کی صلیب پر چڑھ رہا تھا۔ اس لئے وہ جس مقصد کے لئے آئے تھے اُس کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ جمعہ خاں بھی بچے نہیں تھے۔ خان صاحب کی خاکساری، اور عنایتوں کو بے مقصد نہیں جان رہے تھے کہ خان صاحب کہنے لگے ''جمعہ خاں ہم سے برسوں پہلے آپ کی دل آزاری کا جو قصور سرزد ہوا ہے ہم اُس کی تلافی کرنے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام اُس وقت نہیں ہو سکا وہ اب ہو جائے تو جتنی زندگی رہ گئی ہے وہ چین سے جی سکیں گے ورنہ نہ ہم دنیا میں سکون سے رہ سکیں گے اور نہ مرنے کے بعد روح کو چین نصیب ہوگی۔'' جمعہ خاں سراپا سوال بنے ہوئے تھے کہ خان صاحب نے کہا ''ہم بیٹے ندیم کے نکاحِ ثانی کے لئے نسیم بی بی کو.....''

''کیا! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں خان صاحب! میں کیا میری اوقات کیا؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا، کہیں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کرتا ہے۔ اور آپ نے تو.....''

خان صاحب خاموش تھے جیسے وہ جمعہ خاں کے اندر بھبھکتے ہوئے لاوے کو باہر نکلنے دینا چاہتے ہوں۔

وجاہت اللہ خاں نے جمعہ خاں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا ''جمعہ خاں بھول جایئے کل کی باتوں کو ہم خود پشیمان ہیں اپنی سوچ اور اپنے سلوک پر۔ ہم سے واقعی غلطی ہوئی تھی۔ اب ہم اپنی بیٹی کو بھی اپنے اُصولوں کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتے..... ہماری بات مان لیجئے۔''

خان صاحب آبدیدہ ہو گئے۔

''خان صاحب بات ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے..... ندیم آپ کا بچہ ہے..... مگر بات یہ ہے کہ آسمان اور زمین کبھی نہیں ملتے۔''

''جمعہ خان! آپ ہماری کہی ہوئی باتوں کو ہمارے سامنے دہرا کر ہمیں شرمندہ مت کیجئے.....ذرا سوچئے تو سہی ہم کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔''

جمعہ خاں کا دل بھر آیا۔ خان صاحب کے آنسو بہتے دیکھ کر اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں اور پھر زبان سے اتنا ہی کہہ سکے ''خان صاحب جیسی آپ کی مرضی۔''

.....اور آسمان نے جھک کر زمین کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

❁ ❁ ❁

آخری تعاقب

کچھ دنوں سے وہ عجیب نفسیاتی بیماری میں مبتلا تھے۔ انہیں لگتا جیسے ان کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ وہ تعاقب کرنے والوں کو پہنچانتے بھی تھے۔ وہ تین چہرے تھے۔ تین خوشنما چہرے۔ لیکن جب وہی چہرے اچانک بدلنے لگتے، ان کی خوبصورتی آگ میں جھلسے ہوئے بدنما چہروں میں تبدیلی ہو جاتی تو وہ ایک دم خوفزدہ ہونے لگتے۔ وہ کبھی انہیں کنکھیوں سے اور کبھی مُڑمُڑ کر دیکھتے بھی۔ اور ان سے بچنا بھی چاہتے۔

وہ ہمیشہ سے ایسے نہیں تھے۔ بہت خوش مزاج اور قناعت پسند تھے۔ انہیں ایک پرائیوٹ فرم میں ملازمت کرتے ہوئے بائیس سال ہو چکے تھے مگر کسی کی کیا مجال کہ ان کی فرض شناسی اور محنت پر کوئی اُنگلی اُٹھا سکے۔ ان کا باس خود بھی ان کی ذہانت اور بہتر کارکردگی کا معترف رہتا تھا۔ مگر اب؟ اب وہ آفس کی میز پر کہاں ہوتے۔ محض گوشت پوست کا وجود کرسی پر موجود ہوتا۔ بےحس وحرکت اور بے جان سا۔

''شرما جی!''

''جی......جی سر!'' وہ چونک جاتے۔ سر کو دو تین جھٹکے دے کر خود کو بیدار کر کے آفس میں واپس آنے کی کوشش کرتے۔ پھر ہونقوں کی طرح باس کو دیکھتے جیسے وہ کوئی بات کہنے والے ہوں۔

کسی بھی احساس سے عاری بھدے چہرے پر چپکے ہوئے دو ہونٹ ہلتے۔ ''شرما جی یہ آفس ہے۔'' اور شرما جی کے لئے یہ بہت بڑا تازیانہ ہوتا۔ یہ بہت سنگین سزا ہوتی۔ مگر تعاقب کرتے ہوئے وہ تین چہرے!

اور پھر کسی دن ایسا ہی ہوتا۔

''شرما جی! لگتا ہے اب آپ کی عمر کام کرنے کی نہیں رہی ہے۔''

''نہیں سر! وہ بات یہ کہ..... کہ رات کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ اس لئے.....

''نہیں..... یہ بات نہیں ہے۔'' باس شرما جی کی بات کاٹ کر کہتا ''ہم نے ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے مگر آپ کچھ بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ آپ یہ بھول گئے ہیں کہ روح سے عاری جسم کس کام کے رہ جاتے ہیں..... آپ دفتر آتے ضرور ہیں مگر اپنا وجود چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہمیں شرما جی کی ضرورت ہے۔ ان شرما جی کی جو بائیس سال سے اسی کرسی پر کام کرتے ہیں۔

اور شرما جی پھر کچھ نہ بول پاتے۔ ان میں اتنی سکت ہی کہاں رہتی کہ کچھ کہیں۔ ان کے سامنے باس ہوتا جو انہیں ہر ماہ اتنے روپے دیتا کہ مہینہ جیسے تیسے وہ اور ان کے گھر والے گزار لیتے۔ اور ان کے پیچھے تعاقب کرتے ہوئے وہ تینوں چہرے ہوتے جو لمحہ لمحہ ان کے جسم کی سُرخی پر زعفرانی رنگ چڑھاتے۔ باس چلا جاتا اور شرما جی اپنی پلکوں پر سجے موتیوں کو اپنے دامن میں چھپاتے رہتے۔

شرما جی کا حال آفس، گھر اور راستے سبھی جگہ ایک جیسا تھا۔ وہ تینوں چہرے بھی تو ہر جگہ اُن کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ چہروں سے نہیں گھبراتے اگر وہ اپنی ہیئت نہیں بدلتے۔ وہ جب آگ کی لپٹوں سے باہر آتے کھال جھلس جاتی اور چہرے اتنے مہیب اور بدنما ہو جاتے کہ شرما جی لرز جاتے۔ ان کی بیوی کہتی ''آپ کیوں اتنے گھبرائے ہوئے ہیں؟ آپ کیوں اتنے خوفزدہ ہیں؟ تو وہ جھنجھلا کر کہتے۔ ''تم دیکھ نہیں رہی ہو ان حسین چہروں کو جو ابھی ڈراؤنی شکل اختیار کرنے والے ہیں..... تمہیں ڈر نہیں لگتا ان سے'' اور شرما جی کی بیوی ان کی اس حالت پر

آبدیدہ ہو جاتی اور سمجھاتی ''آخر تم اکیلے تو نہیں اس دنیا میں۔ تمہارے جیسے اور بھی ہیں جب وہ خوف محسوس نہیں کرتے تو تم کیوں کرتے ہو؟ کیا کوئی کام ایشور کی مرضی کے بغیر ہو سکتا ہے؟ تم نے کبھی اپنا چہرہ بھی آئینے میں دیکھا ہے۔ کیا ہو گیا تمہیں۔'' وہ شرما جی کو تسلی دیتے ہوئے پسینے میں شرابور چہرے کو پلّو سے صاف کرتی اور شرما جی کو اس کی باتوں سے قدرے سکون حاصل ہوتا مگر اگلے ہی لمحے پھر وہی سوال داغ دیتے۔

''تم ٹھیک کہتی ہو بھاگوان! مگر یہ چہرے میرا تعاقب کیوں کر رہے ہیں؟''

''دوسروں کا بھی کر رہے ہیں۔ مگر دوسرے تمہاری طرح بزدل نہیں ہیں۔ تمہاری طرح کوئی کوفزدہ نہیں ہو رہا ہے۔'' ذرا توقف کے بعد وہ پھر سمجھاتی ''اس دنیا کا نظام تم نہیں کوئی اور چلا رہا ہے۔ ہمارے معاملات جب ہمارے لئے ناقابل حل ہو جائیں تو پھر اسی پر چھوڑ دیئے جائیں۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے..... مگر میں یہ نہیں مانتا کہ صرف میں ہی بزدل ہوں۔ نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ سب حساس نہیں ہیں۔ سب آج میں جی رہے ہیں کل کی کسی کو فکر نہیں ہے۔''

''تو تم بھی آج میں کیوں نہیں جیتے۔'' شرما جی کی بیوی بور ہو جاتی۔

''آج بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگوں کا آج کربناک ہے۔ ہم ان کے آج کو محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ دوسروں کا یہی آج ہمارا کل ہو سکتا ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہی ہے آج اور کل کی یہ گتھی، شرما جی کی منطق پر ان کی بیوی کہتی..... تم تو پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگے ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ تمہارے اور میرے علاوہ جوان بچے بھی ہیں۔ تمہاری اس حالت سے وہ بھی فکرمند رہنے لگے ہیں۔ ان کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے تمہاری اس کیفیت سے۔''

آج بھی حسب معمول شرما جی گھر سے ٹہلتے ہوئے بس اسٹاپ پر پہنچ گئے تین خوش لباس لڑکیاں ہاتھوں میں پرس لئے خوش گپیوں میں مصروف تھیں شرما جی کو لگا۔ یہی تین چہرے ہیں جو میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ انہوں نے منہ پھیر لیا لیکن چند لمحوں بعد انہوں نے پھر انہیں مڑ کر

دیکھا تینوں چہرے تبدیل ہونے لگے تھے۔شرما جی کو لگا جیسے ان کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ان کی بس آ گئی تھی۔شرما جی جیسے تیسے بس میں داخل ہوئے اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی دو سواریوں کے ساتھ حصّہ داری کر کے کسی نہ کسی طرح ٹک گئے۔بس چل دی اور انہوں نے ٹکٹ لینے کے لئے کنڈکٹر کی جانب جیسے ہی گردن گھمائی وہ تینوں لڑکیاں نظر آ گئیں۔شرما جی جیسے سہم گئے۔انہیں لگا یہ وہی چہرے ہیں جو کچھ ہی دیر میں ڈراؤنے ہو جائیں گے۔انہوں نے طے کیا کہ اب انھیں نہیں دیکھیں گے مگر چند منٹ بعد ہی انہیں لگا کہ ان کی کمر پر کیڑے رینگ رہے ہیں۔انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی مُڑ کر دیکھا ان میں سے ایک لڑکی ان کے سیٹ کے اوپری حصّہ کے سہارے کھڑی تھی اور اس کی اُنگلیاں شرما جی کی گردن کو چھو رہی تھیں۔

''سوری'' شرما جی کے پیچھے مُڑ کر دیکھنے پر اس لڑکی نے کہا اور ہاتھ کو اُوپر کھینچ لیا۔ دراصل بھیڑ کی وجہ سے وہ بغیر سہارے کے کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔شرما جی کچھ کہنے کے بجائے ہونقوں کی طرح مُسکرا کر رہ گئے۔انھوں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر اپنے خیالات کو کسی دوسرے واقعے کی قید میں دینا چاہا مگر انہیں پھر لگا کہ کوئی آکٹوپس ہے جو اُن کی گردن کو جکڑ رہا ہے۔شرما جی کو اب ان تینوں سے شدید خوف محسوس ہوا۔مگر جلدی ہی اسٹاپ آ گیا کچھ لوگ اُترے تو وہ لڑکیاں بڑھ کر سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔انہیں قدرے سکون محسوس ہوا۔

آفس پہنچ کر شرما جی اپنی کُرسی پر بیٹھے اور رومال نکال کر چہرے کا پسینہ خشک کرنا چاہتے تھے کہ متل بابو اخبار لئے ان کی میز پر آ کر بولے ''بھئی شرما جی آج طبیعت بہت بے چین ہے، ناشتہ بھی نہیں ہو سکا۔تین لڑکیوں نے سماج کو ایسا ننگا کر دیا کہ اب سچ پوچھو تو میرا جینے کو جی نہیں چاہتا۔''

ایسا کیا ہو گیا؟'' شرما جی نے تجسس سے پوچھا۔اور متل بابو نے اخبار کھول کر انڈر لائن کی ہوئی خبر اور فوٹو شرما جی کے سامنے رکھ دیئے اور کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح اپنی کرسی پر ڈھے گئے۔

شرما جی نے سیلنگ فین سے لٹکی ہوئی تین سگی بہنوں کی خودکشی کا کربناک منظر دیکھا

جنہوں نے اپنے والدین کی غریبی پر ترس کھایا تھا اور خودکشی کر کے انہیں جہیز فراہم کرنے کی اذیت سے بچایا تھا اور جنہوں نے بے رحم اور ظالم سماج کی گھناؤنی رسم کے خلاف انتہائی ناپسندیدہ مگر زبردست احتجاج کیا تھا۔

شرما جی خبر پڑھنے کے بعد مسلسل وہ تصویر دیکھتے رہے جس میں تین مہیب چہرے تھے۔آنکھیں اُبلی ہوئی، گردن کھنچی ہوئی۔انہیں لگا یہ وہی چہرے ہیں جو ان کا تعاقب کرتے رہے ہیں۔ان کے جانے پہچانے چہرے، ان کی اپنی الکا، سُسما اور انو پما کے چہرے، جنہوں نے جلائے جانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی خودکشی کر لی ہے۔

شرما جی کسی مجسمے کی طرح ساکت و جامد تھے۔ان کی نظریں اب بھی اخبار پر تھیں، پھر اچانک کسی زخمی کبوتر کی طرح گرے، تڑپے اور چند لمحوں میں ہی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

❁ ❁ ❁

عورت کا المیہ

''آخر تم نے سمجھ کیا رکھا ہے مجھے؟.....ایسی بے وقعت چیز جسے استعمال کیا اور پھینک دیا۔ ایسا کھلونا جسے کھیل سے دل بھر جانے کے بعد بچہ اِدھر اُدھر ڈال دیتا ہے۔ تم لوگ ازل سے میرے ساتھ یہی کرتے آ رہے ہو.....تم نے کبھی نہیں سوچا.....تمہارا دل کبھی نہیں پسیجا کہ میں بھی ایک ذی روح ہوں۔ تمہاری طرح میرا جسم بھی گوشت پوست سے بنا ہے.....میرے جسم میں بھی خون گردش کرتا ہے.....مجھے بھی عقل وشعور سے نوازا گیا ہے۔ میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے.....میرے بھی کچھ جذبات ہیں.....مجھے جانتے ہو نا!.....میں ایک عورت ہوں۔''

''مگر یہ سب تم مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو۔؟''

''اس لئے کہ تم ایک مرد ہو.....دوسرے مردوں کی طرح.....تم بھی وہی سوچتے ہو جو دوسرے مرد سوچتے ہیں۔ تم بھی وہی سب کرتے ہو جو دوسرے مرد کرتے رہے ہیں.....تم ان ہی کے نمائندے ہو۔''

میں اپنے بیڈ روم میں خمار آلود آنکھیں لئے تنہا بیٹھا تھا گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے..... وہ جو بھی تھی اس سے نظر ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں خوفزدہ تھا مگر میں نے ہمت مجتمع کر کے نہایت نرمی سے کہا.....''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا جو قابلِ گرفت ہو.....''

''جھوٹ بولتے ہو تم.....تم نے مجھے گناہوں کی دیوی کہا۔ دنیا میں گناہ پھیلانے کا سبب گردانا۔ آدم کو جنت سے نکلوانے کی تہمت لگائی حالانکہ اللہ نے اپنے پاک کلام میں صاف صاف کہا کہ دونوں کو شیطان نے بہکایا تھا۔ تمہاری اس بدعقیدگی نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا اور میں تمہارے قلب ونظر کی تسکین کا سامان بن کر رہ گئی۔ اس پر کہتے ہو تم نے کچھ نہیں کیا.....تم نے مجھے زندہ درگور کیا۔ اپنی جھوٹی شان اور برتری کے لئے مجھے پیدا ہوتے ہی قتل کیا..... ہاں میں مانتی ہوں ایک ایسا شخص بھی آیا جس نے مجھے قعرِ مذلت سے نکالا.....میرا مرتبہ ومقام تم پر آشکارا کیا.....میرے حقوق متعین کئے۔ مجھے برابری کا درجہ دیا.....میں اس کا احسان رہتی دنیا تک نہیں بھول سکتی.....مگر تم بھول گئے.....اپنے ہمدرد اور بہی خواہ کی سچی باتوں کو۔ یا تو تم نے یقین نہیں کیا یا پھر شاید غیروں کے زیرِ اثر رہ کر انھیں بھلا دیا۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو.....میں نے بھی ایسا کچھ پڑھا ہے''۔ میں نے اپنے سرہانے رکھے ہوئے ''خواتین نمبر'' کو ہاتھ میں اُٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔ یہی باتیں اس میں لکھی ہیں.....مگر یہ سب ماضی کی باتیں ہیں۔ میرا ان سے کیا تعلق؟.....''میں نے سر اُٹھا کر اوپر دیکھنے کی جرأت کی۔ میرے سامنے کچھ نہیں تھا سوائے نیم تاریکی کے.....کمرے میں صرف نائٹ لیمپ جل رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ کھڑکی پر پڑے پردے کے پیچھے کوئی ہیولا سا ہے.....مگر یہ شاید میرا وہم تھا۔

وہ قہقہے لگانے لگی۔

''میرے سامنے آؤ.....آخر تم ہو کون؟''

وہ پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی.....''میں ایک عورت ہوں اور تم نامحرم۔ یہی تو تمہاری عیاری ہے کہ پہلے تم نے بے پردہ کیا اور پھر بے لباس.....یہی سب کچھ تو تھا میرا سرمایہ۔ یہیں سے بے حیائی اور فحاشی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا.....میں تمہارے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں..... مجھے سامنے بلا رہے ہو..... پھر میری تعریف کرو گے کہ میرے اعضائے جسمانی کو مختلف اشیاء سے تشبیہ دو گے۔ غرض کہ مجھے ہر طرح سے رِجھاؤ گے اور پھر ''یوز اینڈ

تھرڈ' والی چینی اشیاء کی طرح سلوک کرو گے.....کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ بولو.....جواب دو۔
''

میں کیا جواب دیتا۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں واقعی شرمندہ تھا.....میری جوانی کے گزرے ہوئے دس سال ذہن کی اسکرین پر میرے سامنے موجود تھے۔ نازیہ سے عمداً منگنی توڑ کر فرحین سے شادی کر لینے اور پھر فرحین کو طلاق دے کر راشدہ سے رشتہ قائم کر لینے میں زیادتی ہمیشہ میری ہی طرف سے ہوئی۔

''سر جھکائے کیا گریبان میں جھانک رہے ہو؟'' پھر اس کی آواز دماغ میں گونجی۔ ''یاد آ گیا نا سب کچھ۔ تم مجرم ہو نا!۔''

''نہیں سارا قصور میرا نہیں ہے۔ کسی نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا۔ کسی نے میری مرضی نہیں مانی اور کسی نے میرا حکم ماننے سے صاف صاف انکار کیا.....آخر میں مرد ہوں مرد.....''

''یہی تو زعم ہے تمہیں.....زعمِ باطل کہ میں مرد ہوں۔ ہمیشہ میری خواہش، مرضی اور حکم کا احترام ہو.....ورنہ عورت کی زندگی دوزخ سے بھی بدتر کر دی جائے گی.....آخر تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ تمہارا وجود خود میرا مرہونِ منت ہے.....صرف تم.....کچھ بھی تو نہیں ہو۔ تم تو راشدہ سے بھی نباہ نہیں کر سکے.....اب اکیلے ہو اور پھر کسی کو بربادی سے ہمکنار کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ کیوں کہ ابھی تم بوڑھے نہیں ہوئے ہو.....جذبات کے سرکش گھوڑے کبھی کبھی بے لگام ہو جاتے ہیں.....یہی تو ہے تمہاری سوچ کی غلطی.....تمہیں میری ضرورت جوانی ہی میں نہیں ہر عمر میں ہے۔ ماں کی ممتا اور شفقت، بہن کی ہمدردی اور رفاقت اور بیٹیوں کا پیار تم نے کبھی محسوس نہیں کیا.....اور بیوی تو ایسی دوست، مشیر اور ہمراز ہوتی ہے کہ کوئی دوسری ذات اُس کے مماثل نہیں ہوتی.....مگر تم پر تو وقتی لذت کے حصول کا بھوت سوار رہتا ہے.....بس۔''

میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ رات کے آخری پہر کا آغاز ہونے والا

تھا۔ میں سونا چاہتا تھا، اس لئے کمبل کو پیروں میں پھنسا کر سر سے تان لیا مگر اس مہیب سناٹے میں شاید نیند بھی ڈر کر غائب ہوگئی تھی۔

''سونے کی کوشش کر رہے ہو بزدل مرد.....نہیں سنے جاتے اپنے کرتوت؟''

میں نے دائیں بائیں کروٹ بدلی اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تمہاری دو کم سن بیٹیاں برابر کے کمرے میں ہیں۔ چھوٹی بہن کے ساتھ۔ کیا تم ان تینوں کو آئیٹم گرل کے لباس میں ڈانس کرتا دیکھ سکتے ہو؟ کیا تمہیں اُن کا لباس کے نام پر دو چار گرہ کے دو کپڑے لپیٹے ریمپ پر چلنا اچھا لگے گا؟''۔

''نہیں.....نہیں.....ہرگز نہیں۔'' میں چیخ پڑا۔

''کیوں نہیں ؟..... یہ تو آزادیٔ نسواں اور مساوات کی نمائندہ تصویریں ہیں۔ یہی آزادی تو تم نے مجھے دی ہے.....اب نہیں نہیں کی رٹ کیوں لگا رہے ہو؟ کیا ایسا ہی تمہارا معاشرہ تھا۔ کیا یہی تمہاری تہذیب تھی؟''۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو.....مگر تم چاہتی کیا ہو؟''

''میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ محض تمہاری نہیں نہیں کی رٹ سے کچھ ہونے والا نہیں .....جاؤ دیکھو تینوں کمرے میں ابھی تک یہی سب کچھ دیکھ رہی ہیں اور سیکھ رہی ہیں۔''

''کیا.....؟''

''حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ببول کا پیڑ لگا کر آم کھانے کی اُمید رکھنا محض حماقت ہے جو ماں کے زندہ ہوتے ہوئے یسیر ہوگئی ہوں۔ جن کے لئے تمہارے پاس وقت نہ ہو.....اُن کی تربیت کون کرے گا؟.....سوچو.....سنجیدگی سے سوچو۔'' اور پھر بہت دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ وہ چلی گئی تھی۔

میں سر جھکائے اپنے کریہہ ماضی کو تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میری کیفیت اُس مزدور جیسی تھی جس نے صبح سے شام تک کسی زیرِ تعمیر بلند عمارت کی اوپری منزلوں پر اینٹیں پہنچائی ہوں۔ میرا سارا جسم بے سکت تھا۔ میں اب سونا چاہتا

تھا تا کہ طبیعت میں ہلکا پن آ جائے کہ دُور کہیں سے لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی آواز آنے لگی۔ چند منٹ کے وقفہ سے آس پاس کی مساجد سے بھی وہی آوازیں سنائی دینے لگیں "نماز نیند سے بہتر ہے۔"

میں اُٹھا، باتھ روم گیا۔ غسل کر کے جب میں مسجد پہنچا تو کئی آنکھیں مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں ناشتہ سے فارغ ہو کر راشدہ کو منا کر واپس لے آؤں گا۔ اب مجھ سے زیادہ میرے بچّوں کو اُس کی ضرورت ہے.....اور اُسے ہم سب کی۔

❁ ❁ ❁

سرپرائز

چپراسی نے جب ایک وزیٹنگ کارڈ خانصاحب کی میز پر پیپرویٹ سے دبایا تو انھوں نے فوراً ہی اسے دیکھا اور کہا..... ''انھیں اندر بھیج دو۔''

خانصاحب کے روبرو ایک پردہ نشین باوقار خاتون کھڑی تھیں جن کی سیاہ برقع سے صرف دو آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

''السلام علیکم'' خاتون نے خانصاحب کے نظر اُٹھاتے ہی کہا اور ایک قدم آگے بڑھ کر فائل سامنے رکھ دی۔

''وعلیکم السلام..... آپ تشریف رکھیے۔''

وہ فائل دیکھتے رہے۔ ایک ایک ورق الٹتے رہے۔ پھر بولے ''ہم اسے اتفاق کہیں یا پھر کچھ اور..... کہ ادھر چند روز قبل ہمیں اسی پوسٹ کے لئے ضرورت محسوس ہوئی ہم نے اپنے آفس کے چند ساتھیوں سے ذکر کیا۔ ہم اخبارات میں اشتہار تک بھی نہیں دے پائے تھے۔ آپ تشریف لے آئیں۔''

''سر آپ میرا انٹرویو لے لیجئے۔ اگر میں اس پوسٹ کے لئے مناسب ہوں تو مجھے.....''

''ارے بیٹا! ''عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں'' میرے سامنے آپ کے

سارٹیفکٹس اور مارکس شیٹس کی کاپیاں ہیں۔آپ کی یہ درخواست ہے جو آپ نے ملازمت کے لئے لکھی ہے۔آپ سے گفتگو کرر ہا ہوں.....کیا یہ سب انٹرویو کا حصہ نہیں ہیں.....؟''

انھوں نے پھر مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولے.....''شائستہ بی بی! آپ جان لیجئے کہ آپ کا تقرر ہو گیا ہے۔آپ کو ۲؍اپریل کو جوائن کرنا ہے،آپ کو اپائنٹمنٹ لیٹر تین چار روز میں مل جائے گا۔ ہمارا ارادہ یہ ہے کہ آپ کو آفس میں مردوں کے درمیان نہ بٹھائیں اس لئے اسی ہال میں ایک مناسب کیبن بنوا دیا جائے گا.....ویسے بھی اسٹینو کی ضرورت ہمیں ہی پڑے گی۔''

خان صاحب معظم علی خاں خاندانی جاگیردار اور رئیس تھے۔ جب بڑے اور مالدار گھرانوں کے بچے اپنی عمریں پتنگ بازی، کبوتر بازی اور بعض دوسری بازیوں میں ضائع کر دیتے اور جائدادیں فروخت کر کر کے گزر بسر کرتے اور جھوٹی شان بنائے رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔معظم علی خاں نے اعلیٰ اور معیاری تعلیم حاصل کی۔ پہلے اپنے شہر اور اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔تعلیم سے فراغت کے بعد بھی انھوں نے اپنے قیمتی وقت کو لایعنی باتوں اور کاموں پر صرف نہیں کیا بلکہ اسے بزنس میں لگایا اور یہی بزنس اب اُن کی عزت،شہرت اور دولت کا سبب بن گیا تھا۔

جس دن شائستہ بی نے آفس جوائن کیا،معظم علی خاں نے انھیں بہت سی نصیحتیں کیں اور عورت کی عظمت و حیثیت کے بارے میں سمجھایا۔ پھر جاب سے متعلق کچھ ضروری باتیں بتائیں اور شائستہ بی نے اپنے کیبن میں پہنچ کر اپنی سیٹ سنبھال لی۔

ایک ڈیڑھ ماہ کے قلیل عرصے میں شائستہ بی نے اپنی پوسٹ سے متعلق ذمہ داریوں پر اسقدر قدرت حاصل کر لی تھی کہ خانصاحب کو بعض اوقات حیرانی ہوتی تھی۔ کیوں کہ بہت سی باتیں تجربہ سکھاتا ہے اور اگر ایک ناتجربہ کار اسٹینو سے ایسی صلاحیتوں کا ظہور ہو تو حیرانی تو ہو گی ہی۔

ایک دن خان صاحب نے کہا.....''شائستہ بی بی! ہم آپ کے کام سے مطمئن ہیں اس

لئے آپ کی سیلری میں اضافہ کر رہے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ.....جزاک اللہ۔''

''دعا تو ٹھیک ہے مگر شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے یہ سب آپ کی کام کے تئیں لگن اور محنت کا نتیجہ ہے.....اور ہاں، ہم نے دیکھا کہ آج آپ رکشہ سے اُتر رہی تھیں فرم آپ کو اسکوٹی خریدنے کے لئے غیر سودی لون دے سکتی ہے آپ مناسب قسطوں میں سیلری سے وضع کرا دیجئے گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ سر! مجھے اسکوٹی چلانا نہیں آتی ہے۔'' شائستہ بی نے وضاحت کی۔

''بہر حال جب چاہیں اس سہولت سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں۔''

مگر خانصاحب کی اس آفر کو ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک دن جمعہ خاں نے رازدارانہ انداز میں کہا.....''صاحب! یہ جو میم صاحب ہیں نا.....جو آپ کے آفس میں بنے کیبن میں بیٹھتی ہیں دفتر سے کچھ دُور جا کر فرحان صاحب کی بائک پر بیٹھ کر جاتی ہیں۔''

خان صاحب نے چونک کر جمعہ خاں کو دیکھا جن کی ذمہ داری فائلوں کو ایک میز سے دوسری میز تک پہنچانا تھا یا پھر بازار سے سودا وغیرہ لانا.....'' آپ نے کب دیکھا؟۔''

''کئی بار صاحب۔'' جمعہ خاں بولے۔

''خیر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ دفتر کے کام سلیقے سے کرتی ہیں ان کی ذاتی زندگی سے ہمارا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔'' کہنے کو تو خانصاحب نے اُن سے یہ کہہ کر اس واقعہ کو بے حیثیت ظاہر کر دیا لیکن انہیں شاک ضرور لگا۔ ان کا اعتماد ضرور متاثر ہوا۔ مگر وہ بڑے بردبار اور باظرف انسان تھے۔ وہ بہت دیر تک اس تعلق سے سوچتے رہے۔ انھوں نے شائستہ بی کی آنکھوں میں جو حیا اور الفاظ میں صداقت محسوس کی تھی کیا وہ محض بناوٹی تھی، فریب کاری تھی۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ کلیم عابد کی بیٹی ایسی نہیں ہوسکتی۔ ہماری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ فرحان ایک سنجیدہ اور شریف نوجوان ہیں۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ ہم نے تو اپنے

اسٹاف سے شائستہ بی کا فاصلہ بنائے رکھا ہے۔انھیں اپنے آفس میں کیبن بنا کر دینے کا مقصد بھی تو یہی تھا.....وہ دونوں کیسے متعارف اور بے تکلف ہوئے.....جو کچھ جمعہ خاں نے کہا ہے اگر یہ سچ ہے تو پھر ہم شائستہ بی کی تقرری کو خارج کر دیں گے۔

معظم علی خاں دن بھر گم صم سے رہے۔آج اُن کے چہرے پر وہ بشاشت نہیں تھی جو معمول کے مطابق ہوا کرتی تھی۔شائستہ بی نے بھی اُن کی اس ذہنی پریشانی کو محسوس کیا۔ اگلے دن بھی ان کا رویّہ تقریباً سرد ہی رہا۔شائستہ بی کے سپرد کوئی کام بھی نہیں کیا لیکن آفس ٹائم کے بعد جب شائستہ بی اپنے کیبن سے نکلیں اور خان صاحب کو سلام علیک کرتی ہوئی رخصت ہونے لگیں تو وہ بولے.....''شائستہ بی! یہاں آیئے۔''

''جی۔''وہ ان کی ٹیبل کے پاس پہنچیں۔

''آج آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

''کہاں سر!۔''

''آپ کے یہاں.....ہم کلیم عابد صاحب سے مل کر اُن کی مزاج پُرسی کرنا چاہتے ہیں۔''

''سر یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔''پھر وہ وہاں سے ہٹ کر موبائل پر نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

خان صاحب اُٹھے تو وہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں۔

شائستہ بی بی! ہم آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنا چاہتے تھے۔''

وہ کچھ گھبرائیں۔خدا جانے سر کیا کہنا چاہتے ہیں؟''جی فرمایئے۔''

''وہ یہ کہ بیٹا ہم نے یہ پیش کش کی تھی کہ آپ اپنے لئے اسکوٹی خرید لیں مگر آپ نے اُسے رد کر دیا تھا حالانکہ آج کے حالات میں اسکوٹی چلانا معیوب بات نہیں ہے،ضرورت ہے۔معیوب بات یہ ہے کہ آپ کسی سے لفٹ لیں.....یہ دور جیسا بھی ہے آپ بھی جانتی ہیں ۔ایسے ناگفتہ بہ حالات روزانہ اخبارات کے ذریعہ سامنے آرہے ہیں کہ قریبی رشتے بھی اب

مشکوک سے لگنے لگے ہیں.....آپ میری بات سُن رہی ہیں نا!۔''

''سر میں سن بھی رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں۔آپ کے ایک ایک لفظ میں خلوص ہے ،شفقت ہے اور اپنائیت بھی۔''اور خانصاحب زیرِلب مسکرا دیئے۔

شائستہ بی کی سمجھ میں اب صورتِ حال آرہی تھی۔خان صاحب جس بات کا اظہار اِن ڈائرکٹ فرمارہے تھے،اسی کو پیشِ نظر رکھ کر وہ کل سے آج تک کی ساری کڑیاں جوڑ رہی تھیں۔

''سر! آج کی شام ہمارے لئے خوشیوں بھری یادگار شام ہوگی۔''شائستہ بی نے چند لمحوں کی خاموشی کو توڑا۔

''اچھا! بھئی ایسی کون سی بات ہونے جارہی ہے۔''انھوں نے مصنوعی تبسم کے ساتھ پوچھا حالانکہ وہ ایسا فیصلہ لے سکتے تھے کہ آج کی شام غم کی شام' سے بھی تعبیر کی جاسکتی تھی۔

''سر! میرے شوہر کی خواہش تھی کہ آپ کبھی ہمارے مہمان بنیں۔''شائستہ بی نے کہا تو وہ چونک کر بولے.....''کیا.....؟؟؟ کیا آپ کے شوہر بھی ہیں۔آپ نے کبھی ہمیں بتایا بھی نہیں۔''

''سر! اس کی نوبت ہی کہاں آئی۔حالانکہ وہ مجھ سے کئی بار اصرار کر چکے ہیں کہ سر تم پر خصوصی شفقت فرماتے ہیں تمہاری بات ضرور مان لیں گے،تم انھیں کبھی چائے پر ضرور مدعو کرو۔''شائستہ بی نے کہا۔

خان صاحب معظم علی خاں نے شائستہ بی کے انکشاف پر لمحہ بھر کے لئے سنجیدگی سے غور کیا.....ایک شادی شدہ خاتون کے لئے کسی غیر مرد کے ساتھ بائک پر جانا زیادہ معیوب اور نقصان دہ بات ہوسکتی ہے کیوں کہ شوہر اور بیوی کے درمیان اگر غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو ازدواجی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ایک باحیا، باحجاب شادی شدہ خاتون جو ہماری نصیحت اور خدشات کے اظہار پر اپنی تائید کی بھی مہر لگاتی ہے اور جمعہ خاں کی اطلاع کے مطابق ایک ایسے فعل کی مرتکب بھی ہورہی ہے جو اس کی ازدواجی زندگی کے لئے کبھی بھی خطرناک ہوسکتا

ہے.....شائستہ بی کے متضاد رویّے سے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھے۔

شائستہ بی کا مکان آ گیا تھا۔ وہ گاڑی سے اُتریں۔ پھر خان صاحب کی جانب کا ڈور کھولنے لگیں۔ ڈرائنگ روم کھلا ہوا تھا۔ کلیم عابد صاحب اپنے نحیف وزار وجود کے ساتھ ایک صوفے پر گٹھری بنے بیٹھے تھے.....خان صاحب ان کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگے..... شائستہ بی اندر چلی گئی تھیں۔

کچھ ہی وقفہ کے بعد شائستہ بی چائے کی ٹرے لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں.....پھلوں اور نمکین کی ٹرالی پہلے سے موجود تھی.....خانصاحب سوچ ہی رہے تھے کہ بات کہاں سے شروع کروں کس طرح اپنے خدشات کا اظہار کروں۔

''السلام علیکم۔'' شائستہ بی کے شوہر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تو خیالات کی وادیوں سے نکلتے ہوئے خاں صاحب نے وعلیکم السلام کہا پھر اچانک سر اُٹھا کر دیکھا۔

''ارے .....ارے فرحان میاں آپ؟۔'' خان صاحب پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے.....

''یہ میرے بھتیجے تو تھے ہی.....داماد بھی ہیں۔'' کلیم عابد صاحب بولے۔''فرحان میاں نسیم عابد کے بیٹے ہیں۔''

''ارے بھائی خوب ہیں آپ دونوں۔'' پہلی بار خان صاحب قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولے۔''اب ہم سمجھے شائستہ بی کی قبل از وقت درخواست کے موصول ہونے اور کام میں مہارت ہونے کے پیچھے فرحان میاں کا ہی ہاتھ تھا.....'' وہ کھڑے ہوئے اور فرحان نسیم کو گلے سے لگالیا۔ شائستہ بی کے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔''اللہ تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔'' پھر پرس نکالا۔ ایک ہزار روپے والے دو نوٹ شائستہ بی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے.....آج شادی کی پہلی سالگرہ ہے نا! اس لئے ہماری طرف سے کوئی تحفہ خرید لینا۔''

چائے لینے کے بعد خانصاحب حیرت اور خوشی کے جذبات سے لبریز لہجے میں یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے''بھئی کیا خوب سرپرائز دیا ہے آپ دونوں نے۔'' ❁ ❁

کاش!

وہ شہر سے متصل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، لیکن شہر کی آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شہری حدود بھی بڑھتی گئیں اور اب گزشتہ چند برسوں سے وہ شہر کا ہی ایک وارڈ بن گیا تھا اور نگر پالیکا پریشد کے زیرِ انتظام آ گیا تھا.....وہاں کے ساکنان میں کچھ زراعت پیشہ خاندان تھے ان کے علاوہ سستی زمینیں مل جانے کی وجہ سے غریب اور مزدور طبقے کے افراد نے اپنی حیثیت کے مطابق مکان بنا لئے تھے۔

آج دفتر کی چھٹی تھی اور میں اپنے ایک شناسا پلمبر کی تلاش میں گیا تھا جس نے اپنا مکان اسی بستی میں بتایا تھا۔بستی میں داخل ہونے کے بعد کوئی ایسا شخص سامنے نہیں آیا جس سے میں مطلوبہ شخص کا گھر معلوم کرتا، مگر سامنے نیم کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے کچھ لوگوں کو دیکھ کر میں نے اپنی سائیکل اسی سمت بڑھا دی۔ بانس کی چارپائی پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص نیم دراز تھا اور حقے کے کش لے رہا تھا۔آس پاس دو تین لڑکے زمین پر اکڑوں بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔

''میاں جی سلام۔''

''وعلیکم السلام''میں نے کہا اور سلام کرنے والے شخص نے ایک لڑکے کو اشارہ کر کے کہا ''میاں جی کے لئے کرسی اُٹھا لا۔''

''تم مجھے جاننے پہچاننے لگتے ہو۔''میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی میاں جی.....آپ کا خیال ٹھیک ہے.....میں آپ کا غلام ہوں۔رمضان میں ڈنکا بجا کر میں ہی تو جگاتا ہوں.....پچھلے رمضان کو آپ نے مجھے کرتہ بھی دیا تھا۔''

اب میں جمعہ شاہ کو پہچان گیا تھا۔ وہ پیشہ ور بھکاری تھا۔ میرے سامنے ہی نوعمری سے بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچ رہا تھا اور اب بس ماہِ رمضان میں دو تین بار سحری کے وقت جگانے آتا۔ اور عید کے بعد اپنا حقِ محنت طلب کرنے آ جاتا۔ ہر گھر سے پچیس پچیس پچاس پچاس اور سو روپے تک وصول کر لیتا..... اب عام بھکاریوں سے اس کی حیثیت مختلف تھی۔ ہرے رنگ کا لمبا کرتہ، سر پر صافہ، پیروں میں تہہ پہنے، کندھے پر جھولی، گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی ڈھیر ساری مالائیں اور ہاتھ میں چھڑی اُس کی شناخت تھے۔

جمعہ شاہ نے پلمبر کا پتہ بتا تو دیا لیکن پھر وہاں بیٹھے ہوئے ایک لڑکے سے اسے بلانے کے لئے بھی کہہ دیا..... کچھ توقف کے بعد وہ چارپائی سے اُٹھا اور بولا..... ''آؤ میاں جی! ہم فقیروں کی چائے پی کر ہماری عزت بڑھا دو..... آپ تو ہم پر کرم کرتے ہی رہتے ہیں۔''

جمعہ شاہ نے کچھ اس طرح درخواست کی کہ میں رد نہیں کر سکا۔

''تمہارا گھر یہیں کہیں ہے؟۔''

''یہی ہے جہاں آپ ہیں میاں جی!۔''

جمعہ شاہ مجھے اپنے مکان میں لے گیا..... ڈھائی تین سو گز میں بنا پختہ مکان، رنگ و روغن کیا ہوا، قطار میں بنے ہوئے تین چار کمرے۔ ان کے آگے وسیع دالان اور کشادہ آنگن..... سامنے کچن، اسٹور، باتھ روم اور ٹائلٹ وغیرہ۔ بائیں جانب ٹین شیڈ میں بندھی دو بھینسیں.....

مکان میں اور کوئی نہیں تھا۔ سارے کمرے باہر سے بند تھے۔ جمعہ شاہ نے پہلا کمرہ کھولا اور کہا..... '' آیئے میاں جی! یہاں بیٹھیں۔'' اُس نے پہلا کمرہ کھولتے ہوئے کہا۔

کمرے میں دو بھاری بھرکم مسہریوں کے درمیان چوکیوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ٹی وی رکھا تھا تو دوسرے میں فرج۔ کمرہ سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ صاف ستھرے بیڈ شیٹس تھے۔

دس منٹ کے بعد جمعہ شاہ ایک ٹرے میں ایک کپ چائے، گلوکوز کے بسکٹ اور نمکین

رکھے ہوئے اندر آیا اور ایک چھوٹی میز میرے قریب کھسکا کر ٹرے اُس پر رکھ دی۔

میں جمعہ شاہ کے مکان کو دیکھ کر حیران تھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس نے میرا مکان اندر سے نہیں دیکھا ہے ورنہ آج میرا قد اُس کے سامنے بہت چھوٹا ہو جاتا۔

''تمہارے بچّے کتنے ہیں؟'' میں نے چائے پینے کے دوران جمعہ شاہ سے پوچھا۔

''تین ہیں میاں جی..... تینوں کام پر گئے ہوئے ہیں۔''

''اور تمہاری بیوی.....؟''

''گھر والی بھی کام پر جاتی ہے۔''

''یہ سب کیا کام کرتے ہیں؟'' میں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

''ارے میاں جی کی باتیں''..... اُس نے اس طرح کہا جیسے میں نے اس سے مذاقاً پوچھا ہو۔ ''اور کیا کام کریں گے؟ یہی مانگنے کا کام کرتے ہیں۔ یہی ہمارا پشتینی پیشہ ہے..... اللہ کا فضل اور آپ لوگوں کی مہربانی ہے آقا بہت اچھی طرح کھلا پلا رہا ہے۔'' پھر اُس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا ''آقا کے کرم سے بہت اچھی گزر رہی ہے۔ اب بچّے اس قابل ہو گئے ہیں، وہ سب لاتے ہیں۔ گھر والی بھی کچھ کما لیتی ہے..... میں تو بہت کم نکلتا ہوں..... ہاں رمضان میں سحری کو ڈنکا بجا کر ضرور جگاتا ہوں..... ثواب کا کام ہے نا!۔''

مجھے جمعہ شاہ کے بھکاری ہونے پر بہت رشک آیا۔ میں ایک ماہ تک پرائیویٹ آفس کی فائلوں میں سر کھپا کر تین ہزار روپے ماہانہ ہی پاتا ہوں جس سے ساری تو دُور آدھی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتیں، خورد و نوش کے مصارف، چار بچوں کی پڑھائی، بجلی، پانی، اور مہمانوں کی تواضع کے سارے مصارف انہی تین ہزار میں کرنے ہوتے ہیں..... جس مشکل سے مہینہ پورا ہوتا ہے یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔

میں جمعہ شاہ کا شکریہ ادا کرتا ہوا اُس کے دروازے سے باہر نکلا تو سوچنے لگا..... کاش! میں کلرکی کرنے کے بجائے یہی پیشہ اختیار کر سکتا!۔ ❁ ❁

تیسری بیوی

فریدہ بی کی شادی انوار صاحب سے طے پا گئی۔
یہ بات جب میرے علم میں آئی تو مجھے حیرت ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ حیرت اس لیے ہوئی کہ انوار صاحب کا رشتہ کیسے قبول کر لیا جب کہ وہ اپنی دو بیوں کو پہلے ہی طلاق دے چکے ہیں اور ان کے مزاج کی سختی کو اکثر لوگ جانتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بھی تعجب تھا کہ یہ کام اتنے چپ چپاتے ہوا کہ میرے علم میں بھی تکمیل کے بعد آیا جب کہ فریدہ بی سے میری دور کی رشتہ داری ہے اور یہ بات ان کے گھر والوں کے علم میں ہوگی کہ انوار صاحب اکثر میرے آفس میں آتے ہیں۔ مجھ سے بھی معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جب کہ لڑکی والے تو شادی سے پہلے بال کی کھال نکالتے ہیں۔ اور نہ ہی انوار صاحب نے کوئی ذکر کیا جب کہ وہ جانتے تھے کہ اشرف میاں سے میرا رشتہ داری کا ڈورہ لگا ہوا ہے۔ اور افسوس اس بات کا تھا کہ فریدہ بی ایک کنواری لڑکی ہے انتہائی شریف النفس اور خوش مزاج لڑکی ہے اُس کا سابقہ ایک ایسے مرد سے پڑ رہا ہے جو سخت مزاج ہے۔ کرخت لہجے میں بات کرتا ہے اور ایک سال کے اندر ہی دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہے لیکن جب میں نے اماں سے افسوس ناک لہجے میں اس ذکر کیا تو وہ بولیں۔ ''بیٹے! مجھے دلی نفرت ہے ایسے ماں باپ سے جو پہلے تو اپنی حماقتوں سے بچیوں کی شادی کی عمر گنوا دیتے ہیں اور جب جوانی ڈھلنے لگتی ہے تو پھر اونے پونے رشتوں کو قبول کر کے انہیں جھونک دیتے ہیں۔''

اماں کی بات ٹھیک ہی تھی۔ اشرف میاں کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں۔ حمیدہ اور رشیدہ۔ فریدہ بی سب سے بڑی تھیں۔ پڑھی لکھی اور سلیقہ مند۔ جو بھی رشتہ آتا اس کی انکوائری اس طرح کراتے کہ جیسے لڑکا ہونے والا داماد نہ ہو بلکہ کوئی مجرم ہو۔ اور پھر انجام یہ ہوتا کہ یا تو خود ہی انکار کر دیتے یا پھر دوسری جانب سے ایسا کر دیا جاتا۔ رفتہ رفتہ رشتے آنا بند ہو گئے۔ اور فریدہ بی ۳۵ سال کی ہو گئیں۔

میرے اظہارِ تاسف کرنے پر اماں نے کہا۔ ''تم کیوں اتنے دکھی ہو۔ آخر وہ بیٹی تو اشرف کی ہے۔ ماں باپ سے زیادہ کوئی دوسرا ہمدرد ہو سکتا ہے؟''

اور پھر فریدہ بی کی شادی ہو گئی۔

میں اس دن کا منتظر رہا کہ انوار صاحب کب وہ ناپسندیدہ کام کرتے ہیں جو سابقہ دو بیویوں کے ساتھ وہ کر چکے ہیں۔ وہ میرے پاس اب بھی بدستور آتے۔ ہمیشہ کی طرح شہر کے حالات اور سیاسی واقعات پر تبادلہ خیال کرتے، مگر مزاج میں نمایاں فرق محسوس ہوتا۔ گھریلو حالات پر نہ کبھی پہلے کہنا پسند کرتے تھے اور نہ اب۔ جب انہوں نے دوسری بیوی کو شادی کر کے آٹھ ماہ بعد طلاق دی تو ان کے ایک عزیز نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں نے جب ان سے پوچھا تو کہنے لگے۔ ''مرد شادی کرتے بھی ہیں اور طلاق بھی دیتے ہیں۔ ہم نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ مگر اس بات کا آپ سے کیا مطلب۔ یہ ہمارے ذاتی معاملات ہیں۔ ہم یہ مردوں کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں کہ گھر کی باتیں باہر کریں۔'' ظاہر ہے اس کے بعد میری ہمت نہیں ہو سکتی تھی کچھ بھی معلوم کرنے کی۔

ایک بار اماں نے ذکر کیا۔ 'میں اشرف کے یہاں گئی تھی۔ وہ تمہاری خیریت معلوم کر رہا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ اُس کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ تم بھی دیکھ آنا۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوتا مگر امجدی آئی تھی اُس نے بتایا اور یہ بھی کہا کہ اشرف میاں کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ علاج کرا کر کل دہلی سے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا پھپھو سے کہنا دیکھنے کو جی چاہ رہا ہے بس میرا دل نہیں مانا۔''

''اماں! فریدہ بی بھی ہو گی۔''

''نہ..... نہیں تھی، میرے جانے سے پہلے ہی اپنے گھر گئی تھی۔''

''وہ کیسی رہ رہی ہے؟''

''ٹھیک رہ رہی ہوگی۔سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے یہ سب؟''

''کچھ نہیں اماں.....بس یونہی۔''

''بس یونہی.....میں خوب جانتی ہوں۔ذرا سی بات مل جائے تو فوراً قلم لے کر بتنگڑ بنانے بیٹھ جاتا ہے۔میں بتائے دیتی ہوں کہ تجھے ایسا کچھ نہیں ملے گا۔میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔دھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں۔فریدہ بی کی شادی کچی عمر میں نہیں ہوئی ہے۔وہ شوہر کی نرم گرم سب جھیلے گی۔کوئی ایسا کام نہیں کرے گی کہ کوڑی کے تین بھی نہ پوچھے۔مرد کا تو کچھ نہیں بگڑتا مگر عورت ایک خاوند سے چند روز بعد بھی چھوٹ جائے تو اپنی قیمت کھو دیتی ہے.....اور نہ ہی اس کا خاوند اب پرانی غلطیوں کو دہرائے گا۔بار بار کی بدنامی کوئی پسند نہیں کرتا۔

فریدہ کی شادی کو ایک سال گزر گیا۔وہ ایک بچے کی ماں بھی ہوگئیں لیکن میرا تجسس کم نہیں ہوا۔میں سوچتا.....کسی کی عادت کب بدلتی ہے جو انوار صاحب کی بدلی ہوگی۔فریدہ بی یقیناً سمجھوتہ کر رہی ہوں گی۔کسی دن بھی طلاق بم پھٹ سکتا ہے۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اور پھر.....

ایک روز اچانک فریدہ بی ہمارے یہاں آگئیں۔مجھے بڑی حیرت ہوئی۔اماں سے لپٹ گئیں۔مجھے سلام کیا۔میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرا کر کہا''ارے بھئی آج ہمارے یہاں کیسے آگئیں؟''

''جب آپ نہیں آتے چچا جان۔آپ کے یہاں سے کوئی نہیں آتا تو پھر میں بھی نہ آؤں۔''وہ بولیں۔

''بھئی آپ کے یہاں تو ہم دس مرتبہ آتے۔مگر اپنا تماشا تھوڑے ہی بنوانا ہے۔''میں نے کہا۔

انہوں نے برقع اُتارتے ہوئے کہا''میں سمجھی نہیں۔''میرے اس جواب پر فریدہ بی کے چہرے کا تبسم غائب ہوگیا تھا۔

امّاں نے فریدہ بی کے بچے کو گود میں لے لیا۔ اسے پیار کیا اور بلائیں لیتی ہوئی کہنے لگیں۔

''یہ تو بس ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ تمہارا میاں کیسا ہے؟''

وہ بولیں ''اچھی ہوں۔ خوش وخرم ہوں۔ وہ بھی بہت اچھے ہیں۔''

مجھے جھٹکا سا لگا۔ اتنی دیر میں جو بدگمانی میرے ذہن میں اُبھری تھی فریدہ بی نے اُسے وہ بھی بہت اچھے ہیں، کہہ کر دبا دیا۔ میں نے قلم بند کیا۔ فائل میں رکھا اور فائل اندر میز پر رکھ کر ہاتھ میں فولڈنگ کرسی لیے ہوئے باہر نکلا اور فریدہ بی کے سامنے بیٹھ گیا۔ دراصل میں یہ سوچنے لگا تھا کہ ان کی شوہر سے یقیناً اَن بَن ہوگئی ہے اور وہ میرے پاس اس لیے آئی ہیں کہ میں انہیں سمجھادوں کیونکہ یہ بات ان کے علم میں ضرور ہوگی کہ انوار صاحب سے میرے تعلقات ہیں۔

''چچا جان! آپ نے یہ تماشا بنانے کی بات کیوں کہی؟''

''پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔ تم شوہر کے علم میں لاکر یہاں آئی ہو یا لاعلمی ہیں؟''

''آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' فریدہ بی نے کھسیانے انداز میں کہا ''آپ کی اطلاع کے لیے بتادوں کہ میں اُن کی اجازت لے کر آئی ہوں اور انہوں نے بخوشی اجازت دی ہے۔ آج میرا دل سب کو دیکھنے کو بہت چاہ رہا تھا۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اور سچ پوچھو تو میرا دل بھی تم سے ملنے کو بہت چاہتا تھا۔ مگر.....''

''مگر کیا؟''

''مگر یہ کہ.....تمہارے یہاں آتے ہوئے ڈر لگا۔ اس لیے کہ تمہارے شوہر بہت سخت مزاج ہیں شریعت کے پابند ہیں اور اس سے بھی آگے یہ کہ انہوں نے اپنے طور پر زندگی جینے کے لیے اصول وضع کر رکھے ہیں اور.....''

فریدہ نے میری بات کاٹ کر کہا..... ''مگر آپ کو ڈر کیوں لگا۔''

''بھئی اس لیے کہ اگر انہوں نے کرسی دے کر دروازے پر بٹھا دیا اور بات چیت کر کے رخصت کر دیا تو ہمیں توسبکی محسوس ہوگی۔ میں نے کہا۔

''نہیں چچا جان! وہ ایسے نہیں ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہے وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ وہ مزاج

شناس اور نظر شناس ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ان کے اصول کسی کے لیے تکلیف دہ ہوں۔ مہمان کی تو وہ بڑی قدر کرتے ہیں۔"

"وہ ہماری رشتہ داری سے لاعلم تو نہیں ہیں نا"

"نہیں ہیں۔"

"تو پھر آج تک انہوں نے خود کیوں نہیں کہا۔"

"آپ نے کتنی بار اُنہیں دعوت دی۔" فریدہ بی نے فوراً کہا "رشتہ تو آپ کا محترم ہے۔ یہ فرض تو پہلے آپ کو نبھانا تھا۔ پھر وہ مجھے نہیں لاتے یا خود نہیں آتے تو آپ کا یہ شکوہ بجا ہوتا۔"

فریدہ بی کی بات معقول تھی۔ میں لاجواب ہوگیا۔ اماں نے اُن سے باتیں شروع کردیں۔ میں اپنی بدگمانی اور اب تک کے رویّے سے خود ہی شرمندہ تھا۔

"میں انوار صاحب کو لینے جا رہا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی اہلیہ کو اشارہ کیا کہ وہ پہلے چائے اور بعد میں کھانے کا انتظام کریں۔

"چچا جان! وہ آپ کو نہیں ملیں گے۔ فارم پر گئے ہیں۔ میں رکوں گی نہیں۔ صرف دو گھنٹے کے لیے آئی ہوں۔" فریدہ بی نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

میں پھر اُسی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اچھا ایسا کرنا کہ انوار صاحب کا کھانا لیتی جانا۔" میری اہلیہ نے کہا۔

"نہیں! میں جا کر پکاؤں گی۔ وہ فارم پر جانے سے پہلے ایک کلو گوشت دے کر گئے ہیں آ کر بھنا ہوا قورمہ کھائیں گے۔ اس لیے بارہ بجے مجھے گھر پہنچنا ہے۔" فریدہ بی نے وضاحت کی۔

"تو یہ ہے تمہاری کامیاب ازدواجی زندگی کا راز۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ فریدہ بی سے میں ہمیشہ بے تکلف رہا ہوں۔ میری اور ان کی عمر میں چار سال کا فرق ہے مگر فریدہ بی مجھے ہمیشہ چچا جان ہی کہتی رہی ہیں جب کہ مجھے ہی نہیں دوسروں کو بھی عجیب سا لگتا ہے۔

"فریدہ بی! مجھے لگتا ہے تم انوار صاحب سے سمجھوتہ کر رہی ہو۔ ان کے مزاج کی سختی اور ان

کے وضع کردہ اصولوں کو برداشت کرنا بہت دشوار ہے۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے چچا جان.....دراصل انہیں لوگ سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ ایسے ہرگز نہیں ہیں جیسا لوگ محسوس کرتے ہیں۔ان کا ظاہر سب کے سامنے رہتا ہے حالانکہ ان کا باطن اتنا ہی سادا اور نرم ہے جتنا ان کا ظاہر سخت ہے۔''فریدہ بی نے شوہر کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔''سچی بات یہ ہے کہ وہ اصولی انسان ہیں۔ زمانے کا مشاہدہ بہت سنجیدگی سے کیا ہے انہوں نے۔ وہ عورت کو اس کی حدود میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ بیوی ہی نہیں کسی بھی عورت کی ایسی آزادی کے خلاف ہیں جو اس کی نسوانی حیا کو متاثر کرتی ہو۔ وہ بیوی کو ہمدرد اور غمگسار شریک حیات کی صورت میں پسند کرتے ہیں۔ من مانی کرنے والی، اونچی آواز میں بات کرنے والی اور شوہر کی حق تلفی کرنے والی عورت تادیر ان کی بیوی نہیں رہ سکتی یہی وجہ ہے کہ مجھ سے پہلے انہوں نے دو بیویاں رخصت کردیں۔''

مجھے فریدہ بی کے احساسات جان کر خوشی ہو رہی تھی۔ میں نے کہا''لائقِ تعریف وہ نہیں تم ہو جس نے اتنی جلدی ان کے مزاج کو سمجھ لیا۔ میں تمہیں واقعی مبارکباد دیتا ہوں۔''

'ٹھیک ہے۔اس کا کریڈٹ مجھے بھی دیجئے مگر وہ بھی بُرے نہیں ہیں۔ ہرگز نہیں۔ مالی حیثیت سے وہ کمزور نہیں ہیں۔ میری ضرورتوں کا مجھ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔کوئی بے جا پابندی مجھ پر نہیں ہے تو پھر بھی ان کی مرضی کے مطابق نہ چلوں؟''

''شاباش بیٹی! اچھی لڑکیوں کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔''اماں نے فریدہ بی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

فریدہ بی ہنستے ہوئے کہنے لگیں''اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں خوش وخرم رہوں۔غصہ نہ کروں۔ وہ گھر واپس آئیں تو گھر کا ماحول خوشگوار ہو۔ جو سوٹ انہیں پسند ہو وہ پہنوں جہاں وہ لے جائیں میں انکار نہ کروں۔ جس جگہ سے منع تو میں ضد نہ کروں، اور اچھے کھانوں کے وہ شوقین ہیں میں انہیں ان کی پسند کے مطابق کھانا پکا کر کھلاؤں تو اس میں کون سی بُری بات ہے۔ اور مجھے کیا پریشانی ہوسکتی ہے۔''

میری اہلیہ نے چائے اور وائے میز پر لگا کر تواضع کی اور جب فریدہ بی رخصت ہونے لگیں تو میری اہلیہ نے بچے کو سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا"اب آئندہ انوار صاحب کے ساتھ آنا۔ یا پھر تم کہو تو میں اِن سے باقاعدہ دعوت کہلا بھیجوں۔" وہ ہنسنے لگیں۔

امّاں نے ایک بار پھر فریدہ کو سینے سے لگالیا اور بچے کو پیار کیا۔

فریدہ بی تو چلی گئیں لیکن میں گھنٹوں ان کے بیان کردہ کامیاب ازدواجی زندگی کے رہنما اصولوں پر غور کرتا رہا۔ اماں نے مجھے سنجیدہ دیکھ کر کہا"تم اپنے اندازے کی ناکامی کی وجہ سے خاموش ہو یا پھر کوئی اور بات ہے۔"

میں نے کہا"امّاں میرا گمان بھی بے وجہ نہیں تھا۔ اب فریدہ بی جیسی لائق لڑکی کا انوار صاحب کے نکاح میں آجانا ایک اتفاق ہے۔ آپ نے ان کی گفتگو غور سے نہیں سُنی۔ فریدہ بی نے اپنے آپ کو انوار صاحب کی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔"

"میں نے خوب غور کیا ہے اچھی لڑکیاں ایسا ہی کرتی ہیں شوہر کے مزاج اور پسند کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہیں اور خوش وخرم رہتی ہیں۔ تم نے اپنے باپ کا غصّہ نہیں دیکھا تھا۔ بیٹھک میں بیٹھ کر دن بھر لوگوں کو چائے پلاتے رہتے تھے مگر کیا مجال کہ کبھی ہم بنانے سے انکار کردیں۔ آج کل تو ایک دو بار میں ہی منہ بنانے اور کبھی کبھی زبان چلانے لگتی ہیں۔ خاوند کا گھر ایسے ہی تھوڑی ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی خون کے گھونٹ پی کر بھی ہنسنا پڑتا ہے۔ مگر ایسی صورت حال ہمیشہ نہیں رہتی۔ پریشانیاں شروع شروع میں آتی ہیں، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اللہ میری پوتیوں کو بھی سمجھ دے۔"

اور میں نے کہا....."آمین۔"

❁ ❁ ❁

قاتل

اُس کے ہاتھوں پھر ایک قتل ہو گیا۔ مقتول سے اُس کی کوئی دُشمنی نہیں تھی۔ وہ تو اُسے جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ گھر سے کسی قتل کے ارادے سے بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ اب کسی ایسے فعل کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی زندگی کے پانچ دس سال پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیت جائیں اور اس کے بچے یتیموں جیسی زندگی پھر گزاریں۔

وہ کھانا کھا کر ٹہلنے کے لئے نکلا تھا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ اپنے مکان سے باہر ڈیڑھ سو گز کی دُوری تک کئی چکر لگاتا اور واپس آ کر بستر پر دراز ہو جاتا۔ زندگی کے بیش قیمت آٹھ نو سال اُس نے جیل میں گزارے تھے۔ جیل کی مشقتوں، اذیتوں اور مختلف نوعیت کی محرومیوں سے وہ اس قدر ٹوٹ چکا تھا کہ اب ماضی سے رشتہ جوڑنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا تھا..... حالانکہ وہ جرائم پیشہ کبھی نہیں رہا تھا مگر وہ جو کچھ بھی تھا اُس سے اسے بدنامی، رُسوائی اور بدگمانیوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا..... جیل میں وہ عادی مجرموں سے الگ تھلگ رہتا۔ بیرک کے دوسرے قیدی ساتھیوں کے کارنامے اور ان کے مستقبل کے عزائم سنتا تو اُسے اُن سے نفرت ہوتی۔ دوسرے قیدیوں کی طرح اپنی ذات سے جیل کے حکّام کے لئے آزمائش پیدا نہیں کرتا..... شاید یہی وجہ تھی کہ عمر قید ہونے کے باوجود اُسے رعایتیں ملیں اور وہ آٹھ نو سال میں ہی باہر آ گیا۔

وہ حسبِ معمول چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس کے قریب اچانک ایک کار رُکی۔ دو نوجوان پچھلی نشست سے باہر نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں طمنچہ تھا۔ تیسرا نوجوان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا رہا۔ اُترنے والے دونوں نوجوانوں نے کار کے برابر سے گزرتی ہوئی لڑکی کو کار کی پچھلی نشست پر ڈال لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ لڑکی ایک کے بعد دوسری چیخ بھی نہیں مار سکی..... وہ قریب ہی تھا۔ اُس نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان کی کنپٹی پر اپنا ریوالور رکھ کر کہا..... "لڑکی کو چھوڑ دو۔" داہنی جانب بیٹھے اغوا کار نے پچھلی ونڈو سے اُس پر گولی چلا دی۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ گولی اُس کے بائیں بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ پھر کیا تھا اُس نے یکے بعد دیگرے دو گولیاں اسٹیرنگ تھامے نوجوان پر چلا دیں۔ اسی اثنار میں باقی دونوں اغوا کار فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے حالانکہ اُس نے انہیں للکارا بھی.....لڑکی کار سے نکل کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس سے قبل کہ وہ کچھ بول پاتی اُس نے کرخت لہجے میں دوسرا سوال داغا۔ "کس کی بیٹی ہو؟"

"وکیل صاحب کی۔" اُس نے کپکپاتی آواز میں بمشکل آہستہ سے کہا۔

"وکیل؟..... یہ سامنے اقبال حیات کی؟" اُس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"جی۔"

وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر حیران رہ گیا....." جاؤ اپنے گھر۔ رات میں تنہا مت نکلا کرو۔" وہ دہاڑا۔

لڑکی چلی گئی۔ اُس نے ریوالور جیب میں رکھا اور خود ہی پولس چوکی میں پہنچ گیا۔ ریوالور ہیڈ کانسٹبل کی میز پر رکھتے ہوئے واردات کے سلسلے میں وہ اقبالیہ بیان دینے لگا۔

....

سکندر خاں اس علاقہ کا ایک دبنگ شخص تھا۔ دور دراز تک اُس کی بہادری کی دھمک تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ کچھ مشتبہ افراد رہتے۔ سکندر خان کیا کاروبار کرتا ہے اُس کے گروہ

کے لوگ کیا کرتے ہیں؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لیکن لوگ یہی گمان کرتے تھے کہ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے اور یہ احساس انہیں مزید تقویت دیتا اور خوف میں مبتلا کرتا کہ جب بعض اوباش اور بگڑے ہوئے نوجوان اس کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں، اُسے اُستاد کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو پھر یقیناً وہ کوئی خطرناک شخص ہی ہوگا۔

اہلِ محلہ سے سکندر خان کے معاملات و روابط بس اس قدر تھے کہ وہ سامنے سے گزرنے والے کسی شخص کو چچا کسی کو بھتیے اور کسی کو بیٹے کہہ کر سلام کرتا یا وعلیکم السلام کہتا۔ عموماً سلام میں پہل کرتا اور خواتین کے گزرنے پر نظر بچالیتا۔ لوگ سکندر خان کی ان خوبیوں کو محسوس کرتے آپس میں تذکرے بھی کرتے مگر ایک ایسا خوف جسے کوئی نام دینا دُشوار تھا، سبھی کے ذہنوں پر طاری رہتا۔ سکندر خان اور اس کے ساتھی عموماً دروازے سے ملحق ایک کوٹھری نما نشست گاہ میں ہوتے لیکن کبھی کبھی وہ دروازے کے سامنے ٹیلے پر برگد کی چھاؤں میں پڑے تخت پر محفل جمالیتا۔ ضرورت پڑنے پر آنے جانے والے خود نشست گاہ سے کرسیاں لا لا کر بیٹھتے اور جاتے وقت اُنہیں وہیں اُٹھا کر رکھ آتے۔

یہ علاقہ کبھی شہر کا مضافاتی حصہ تھا لیکن تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے یہ شہر کی گھنی آبادی سے مل گیا تھا۔ شہر کے کتنے ہی رئیسوں نے یہاں کھلی فضا میں اپنی کوٹھیاں بنالی تھیں۔ اقبال حیات ایڈوکیٹ بھی اُن میں سے ایک تھے..... حالانکہ ان کے اطراف متوسط اور غریب شہریوں کے اچھے خاصے مکانات تھے..... تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اشیائے ضروری کی کچھ دوکانیں تھیں جو عموماً جلدی ہی بند ہوجاتی تھیں۔ آمدورفت بھی یہاں نسبتاً کم ہی تھی..... مگر یہ صورتِ حال اب سے نو دس سال پہلے تھی۔ اب جب سکندر خاں سزا بھگتنے کے بعد گھر آیا تو یہاں خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ اب یہاں چوڑی سڑکیں بھی تھیں اور تیز روشنی والی اسٹریٹ لائٹیں بھی..... مگر ان دنوں ایک تو کہرے کی دبیز چادر سرِ شام ہی آسمان کو ڈھک لیتی جس سے آسمان سے آنے والی روشنی تو ماند پڑ ہی جاتی..... اسٹریٹ لائٹیں بھی تاریکی کا سینہ چیرنے میں ناکام ہوجاتیں..... پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ گئے برسوں

میں سکندر خاں کا اثر بھی اس علاقے سے زائل ہو چکا تھا۔ ورنہ اس علاقہ میں کسی شاطر بد معاش کو کوئی واردات انجام دینے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ چھٹ بھیّوں کی بات دیگر تھی جو سکندر خان سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ اور واپس آ کر بھی انہوں نے اپنی سابقہ روش اختیار نہیں کی تھی۔ یہ حرکت بھی کن ہی ایسے ہی چھٹ بھیّوں کی تھی جنہیں سنیما، ٹی وی اور انٹرنیٹ کی بے ہودگیوں نے مجرمانہ سرگرمیوں کی جانب راغب کر دیا ہو۔

سکندر خان کو لاک اپ میں بند کر کے پولس موقعِ واردات پر پہنچ گئی تھی اور اس نے مقتول کی نعش اور کار کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

....

سکندر خان کے جیل سے رہا ہونے کے بعد اقبال حیات ایڈوکیٹ انتہائی خوفزدہ رہنے لگے تھے۔ یوں تو وہ ایک نامی گرامی وکیل تھے جرائم پیشہ افراد کے خلاف وہ مقدمات لڑتے ہی تھے لیکن سکندر خان کے خلاف جس شدت اور دلچسپی کا اُنہوں نے مظاہرہ کیا تھا (اور پھانسی نہیں تو عمر قید دلا ہی دی تھی) اُن کا خوف بجا بھی تھا کہ اُن کی نظر میں سکندر خان ایک شاطر، دلیر اور پُر اسرار قسم کا بدمعاش تھا ہی.....اُن کا ہم سایہ بھی تھا جو اُن کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا اور کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اسی لئے کورٹ سے آنے کے بعد وہ کوٹھی سے بہت کم نکلتے تھے اُنہوں نے کوٹھی کے اطراف محافظوں کی تعداد بھی بڑھا دی تھی۔ سکندر خان کا رات میں ٹہلنا بھی انہیں خوفزدہ کرنے کا موجب تھا.....خدا جانے حسنہ بی کس ضرورت سے کوٹھی سے باہر نکلی تھی اور چند قدم ہی بڑھی تھی کہ یہ سانحہ پیش آ گیا.....وہ گھبرائی اور سہمی کوٹھی میں داخل ہوئی اور رو رو کر باپ کو سارا واقعہ بتایا۔

رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ اقبال حیات ایڈوکیٹ تھانے پہنچے اور تھانیدار کی اجازت سے سکندر خان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ لاک اپ میں سکندر خان سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''سکندر خان۔'' اقبال حیات نے آواز دی۔

''جی۔'' اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا...... ''اچھا وکیل صاحب!...... کہئے کیسے تکلیف کی؟''

''سکندر خان! ہم تم سے شرمندہ ہیں۔'' اقبال حیات نے جذباتی لہجہ میں کہا۔

''کس بات کی شرمندگی...... وکیل صاحب! شرمندہ تو آپ سے ہمیں ہونا چاہیۓ کہ ہم......''

''سکندر خان بس...... بس! ہمیں مزید شرمندہ نہ کیجئے۔ آج آپ نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ہم اُس کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔'' اُن کا گلا رندھ گیا، مگر وہ بولتے رہے: ''سکندر خان! تم نے ہماری عزت بچائی ہے۔ اگر بدمعاش اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے...... ہم بھی مر جاتے۔'' شدتِ جذبات سے آواز میں کپکپاہٹ پیدا ہو گئی اور آنسو رخساروں سے ہو کر بہنے لگے۔ ''تم ہمارے محسن ہو سکندر خان۔ ہم تمہارے اس احسان کا بدلہ چکائیں گے...... ہم تمہیں اس نیکی کو عوض سزا سے بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔''

''بہت خوب وکیل صاحب!'' سکندر خان نے بدستور سر جھکائے ہوئے طنز سے کہا ''کل جس کو آپ نے عدالت میں سماج کا بدترین اور انسانیت کا قاتل شخص کہہ کر سزائے موت دیئے جانے کی سفارش کی تھی...... اب اُسے معصوم اور بے گناہ کس منہ سے ثابت کریں گے؟ جب کہ ہم نے خود اقبالی بیان دیا ہے اور ہم عدالت میں بھی اس سے نہیں مکریں گے۔ آپ کو یاد ہو گا ہم نے اعترافِ قتل اُس وقت بھی کیا تھا جب ایک عورت کی ہمارے ہاتھوں جان گئی تھی...... اور ہم نے پوری سچائی سے سارا واقعہ سچ سچ بیان کیا تھا۔ مگر...... خیر چھوڑ یئے اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ اقبال حیات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا ''وکیل صاحب! سکندر خان نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سکندر خان نے کبھی کسی کی بہن بیٹی پر بُری نظر نہیں ڈالی...... نہ کبھی شراب پی اور نہ چوری کی...... سکندر خان نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ یہ سب نیچ کام گھٹیا اور بُزدل لوگ کرتے ہیں۔ سکندر خان دوسروں کا حق دلا کر پیسہ لیتا ہے۔ کسی ظالم کو کمزور پر ظلم نہیں کرنے دیتا...... یہی اُس کا ذریعہ معاش تھا اور یہی اُس کی

بدمعاشی۔"

"سکندر خان! بخدا ہم تمہیں سمجھ نہیں پائے۔ ہم یقین دلانے آئے ہیں کہ ہم اپنی تمام تر صلاحیت اور قابلیت تمہیں انصاف دلانے میں لگا دیں گے۔"

"وکیل صاحب! ہم بہت صاف دل کے آدمی ہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے رات زیادہ ہو رہی ہے..... ہاں ہماری آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اپنی عزت کو یوں وقت بے وقت گھر سے باہر نہ نکالا کیجئے۔ شریف گھروں کی بیٹیاں سچے موتیوں کی طرح ہوتی ہیں جنھیں حفاظت سے رکھا جاتا ہے۔ تبھی ان کی آب بھی باقی رہتی ہے۔ فٹ پاتھ پر سجے موتیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

اقبال حیات ایڈووکیٹ کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں اور وہ انہیں رومال سے خشک کرنے لگے کہ سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ بڑھا کر سکندر خان نے اُن کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا: "وکیل صاحب! مرد روتے نہیں، حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔"

"سکندر خان تم بہت عظیم ہو..... بہت عظیم۔ ہم ہی غلطی پر تھے۔ تم نے ہماری عزت بچائی ہے۔ ہم تمہاری جان بچائیں گے..... انشاء اللہ۔"

"وکیل صاحب! اب آپ یہاں سے چلے جایئے۔ ہمارے زخموں کو کریدیئے مت۔ آپ بات عزت بچانے کی کرتے ہیں تو سنئے..... آج ہی نہیں ہم نے پہلے بھی ایک عورت کی عزت اور لاج بچانا چاہی تھی۔ اُس سے دست درازی کرنے والے، اُس کے گلے سے ہار کھینچنے والے ایک لٹیرے سے بچانے کے لئے اُس پر فائر کیا تھا مگر نشانہ چوک گیا اور عورت ہلاک ہوگئی..... عدالت میں آپ نے ہمیں بدمعاش، زانی، عصمتوں کا لٹیرا، سماج کا ناسور اور کلنگ بھی سبھی کچھ کہا اور ہمیں عمر قید دلا دی۔ ہم سچ کہتے رہے اور جھوٹے قرار پائے اور آپ سب کچھ جھوٹ کہتے رہے اور کامیاب ہوگئے..... مگر آپ بھی کیا کر سکتے تھے۔ آپ کا پیشہ ہی ایسا ہے..... اور پھر وہ عورت آپ کی بیوی بھی تو تھی۔"

❁ ❁ ❁

شہ اور مات

سارے شہر میں گذشتہ کل ہونے والی شادی موضوعِ گفتگو تھی۔ چائے کدے ہوں یا ریسٹورنٹ، پارک ہوں یا محلوں کے چوک۔ جہاں دو چار لوگ اکٹھے ہوتے وہاں منتری جی کی بیٹی کی شادی کا تذکرہ شروع ہو جاتا۔ منتری جی کا ماضی اور حال کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اس پر کل کا انقلابی قدم ہر شخص کو حیرت زدہ کیے ہوئے تھا۔ مقامی اخبارات نے بھی شادی کی خبر اور منتری جی کی تقریر کو نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔

ابراہیم خان صاحب ودھایک جی کے نام سے معروف تھے وہ حالیہ الیکشن میں تیسری بار ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوئے تھے۔ اس بار چونکہ اُن کی پارٹی اکثریت میں آئی تھی اس لئے سرکار بھی اُسی کی بننا تھی۔ ابراہیم خاں ایک دبنگ اور بااثر نیتا مانے جاتے تھے۔ اپنی کانسٹی ٹیونیسی میں وہ زبردست اکثریت سے منتخب ہوتے تھے۔ اس لئے انھیں بھی راجیہ منتری بنایا گیا تھا۔ وہ باہو بلی نیتا کے طور پر مشہور تھے اور مختلف دفعات کے تحت دو درجن سے زیادہ مقدمات ان پر چل رہے تھے۔ مخالف جماعتوں کے سیاسی ورکرس ان کی کھلم کھلا مخالفت سے خوفزدہ رہتے تھے۔ ویسے ان کی عوامی مقبولیت دوسروں سے کہیں زیادہ تھی۔ ابراہیم خاں کے اطراف ان کا نہایت چست پرائیوٹ سیکورٹی دستہ رہتا تھا۔ اب تو خیر انھیں سرکاری سیکوریٹی عملہ بھی حاصل تھا۔

گذشتہ سال جب ابراہیم خاں نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی نہایت دھوم دھام

سے کی تھی اور غیر معمولی جہیز دیا تھا تو شرکار کی آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں.....راجوں مہاراجوں جیسی تقریب تھی وہ۔ یہی سبب تھا کہ چند ماہ بعد مولوی صلاح الدین صاحب نے اپنے بیٹے شجاع الدین کے لئے خانصاحب کی دوسری بیٹی ثمینہ کا ہاتھ مانگا.....مولوی صلاح الدین پڑوسی ضلع کے نمایاں تاجر تھے، خوشحال تھے لیکن کہاں باہو بلی ایم۔ایل۔اے ابراہیم خاں اور کہاں وہ.....مگر اُن کا بیٹا ایک لائق نوجوان تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کسی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، جہاں وہ آئے دن دنیا کے کتنے ہی ممالک کے سفر پر رہتا۔ اس کی ماہانہ یافت بھی تقریباً ڈھائی لاکھ روپے تھی۔ ابراہیم خان کے لئے اس کی ذات ہی قابلِ توجہ ٹھہری اور رشتہ طے ہوگیا۔ اس موقع پر مہمانوں کی اپنے شایانِ شان تواضع کی اور صلاح الدین صاحب سے یہ بھی معلوم کیا کہ آپ کی کوئی خواہش یا مطالبات ہوں تو بلا جھجک فرمادیں لیکن اُن کی جانب سے اس تعلق سے بے نیازی کا اظہار کیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد ہی اسمبلی انتخابات آگئے۔ ابراہیم خان نہ صرف خود ریکارڈ ووٹوں سے کامیاب ہوئے بلکہ اطراف و جوانب کی کئی سیٹوں پر بھی خاصے اثر انداز ثابت ہوئے اور انھیں راجیہ منتری بنا دیا گیا۔

شادی سے تین چار ماہ قبل جب خان صاحب نے مولوی صلاح الدین کو شادی کی تاریخ کے تعین کے لئے مدعو کیا تو موصوف پچیس تیس اعزہ واحباب کے ساتھ تشریف لائے اور دن تاریخ کے علاوہ دوسری ضروری باتیں طے کی گئیں۔

''اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کچھ ضروری باتیں آپ کے سامنے رکھنے کی جسارت کروں؟'' خاصی پس وپیش میں مبتلا رہنے کے بعد مولوی صلاح الدین نے دل کی بات زبان پر لانے کی کوشش کی۔

''ہاں، ہاں فرمایئے۔ اس میں اجازت طلب کرنے کی کونسی بات ہے'' پھر ابراہیم خاں ہنستے ہوئے کہنے لگے ''ارے بھئی، اب ہم سمدھی ہونے جارہے ہیں۔''

''بیشک! آپ نے درست فرمایا'' خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ صلاح الدین

صاحب نے کہا اور پھر ایک ایک کر کے اپنے مطالبات اور جہیز کی کوالٹی کی تفصیل پیش کی۔

ابراہیم صاحب ان کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے پھر بولے "ارے بھئی یہ سب تو ہم اپنی بچی کو دیتے ہی.... آپ تو ہماری بڑی بیٹی کی شادی میں موجود تھے نا!"

"جی ہاں، جی ہاں میں تھا۔" پھر قدرے توقف کے بعد کہا "دراصل یہ سب کچھ تو تمہید کے طور پر تھا۔ سچ یہ ہے کہ ایک خواہش میری ہے اور ایک میرے بیٹے کی۔ درحقیقت اسے ہی آپ کے گوش گذار کرنا تھا۔"

"تو پھر وہی بیان فرمایئے نا!" ابراہیم خانصاحب کا لہجہ دُرشت تھا۔ چہرے کی مسکراہٹ پر سنجیدگی غالب آ گئی تھی۔

"دراصل ہمارے یہاں کا رواج یہ ہے کہ نوشاہ کی جانب سے شادی میں شریک ہونے والے اعزہ اور دوستوں کو عروسہ کے سرپرست تحائف ضرور دیتے ہیں۔"

ابراہیم خاں کے چہرے کا رنگ بدلا، ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں، پھر جلدی ہی انھوں نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا.... "مثلاً کیسے تحائف؟۔"

"یہ تو لڑکی والوں پر منحصر ہوتا ہے کہ کیا تحفہ دیں۔ دراصل لڑکے سے قربت اور رشتہ داری کی نوعیت کے اعتبار سے تحائف منتخب کر لئے جاتے ہیں.... ابھی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے ہمارے شہر کے ایک تاجر نے اپنی بیٹی کی شادی میں تقریباً ڈیڑھ سو موٹر سائیکلیں لڑکے کے اعزہ اور دوستوں کو دی تھیں۔"

خان صاحب نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا.... "مولانا رشتہ منظور کرتے وقت جب ہم نے آپ سے مطالبات کا تذکرہ کیا تھا تو آپ نے شریعت کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ آپ اپنی بیٹی کو جو کچھ دینا چاہیں دیں ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔"

"مگر یہ مطالبہ کب ہے.... یہ تو رواج ہے۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ کہیں آپ کے یہاں یہ رواج نہ ہو اور ہم دونوں کو عین موقع پر شرمندگی نہ اُٹھانا پڑے، اس لئے آپ کے علم میں لائے ہیں.... البتہ مطالبہ تو بس ایک ہے اور وہ بھی آپ کے ہونے والے داماد کا۔ ہم نے

تو اُس سے کہہ دیا کہ یہ بات ہم اپنی زبان سے نہیں کہہ سکیں گے اس لئے یہ ماموں ہیں اُس کے .....یہی بیان کریں گے۔" مولانا صلاح الدین نے انتہائی عیارانہ طور پر اپنے برادرِ نسبتی کی جانب اشارہ کیا.....اور پھر جس قیمتی کار کا مطالبہ کیا گیا تھا اُس نے باہو بلی منتری کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا.....مگر وہ بھی شطرنج کے ایسے ماہر کھلاڑی تھے جن کا ذہن اور چہرے پر آئے تاثرات کو پڑھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی .....شہ اور مات کے کھیل میں کامیابی عموماً اُنہی کا مقدر ہوتی تھی ۔اور جب رخصت ہوتے وقت مولوی صلاح الدین نے مہرِ فاطمی کے تعلق سے سوچنے کا مشورہ دیا تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا....."ارے مولانا! آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر .....اور پھر دونوں جانب شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

چند مہینے پر لگا کر اُڑ گئے ۔شادی کا دن آ گیا۔" کاشانۂ ابراہیم" کو بھی دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔کوٹھی سے ملحق وسیع وعریض لان میں پنڈال بنایا گیا تھا جس میں نہ صرف دونوں خاندانوں کے اعزہ واحباب موجود تھے بلکہ صوبائی حکومت کے کئی وزیر اور ایم۔ایل۔ ایز، کئی ممبرانِ پارلیمنٹ اور اعلیٰ افسران بھی موجود تھے۔اسٹیج پر نوشاہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے ساتھ رونق افروز تھا۔قاضیِ شہر اس کے پاس ہی بیٹھے تھے اور نکاح نامے کے کالمس کی تکمیل میں مصروف تھے۔نکاح میں چند منٹ کا وقت باقی تھا کہ ابراہیم صاحب اپنے سمدھی صلاح الدین صاحب کے ساتھ اسٹیج پر پہنچے اور مائک اُٹھا کر مہمانوں سے مخاطب ہوئے.....

معزز مہمانان.....السلام علیکم وآداب

میں آج کی پُر مسرت تقریب میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں ۔آپ کا استقبال کرتا ہوں اور آپ کا تشریف آوری کے لئے شکریہ بھی ادا کرتا ہوں ۔ میں ممنون ہوں اپنے سمدھی الحاج مولوی صلاح الدین صاحب کا ،جن کی تحریک پر مجھ جیسا گنہگار اور بدنامِ زمانہ شخص ایسا انقلابی قدم اُٹھانے پر مجبور ہوا، جس کی توقع بھی آپ کو نہیں ہوگی .....جی ہاں، آج

کی یہ شادی بیٹوں کی اونچی قیمتیں طے کرنے والوں کے لئے جہاں ایک تازیانہ ہوگی وہیں عام شہریوں کے لئے خوش آئند مثال ثابت ہوگی۔ سماج سے کسی لعنت اور بُرائی کو مٹانے کے لئے محض وعظ و نصیحت کافی نہیں ہوتے بلکہ عملی اقدام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ہونے والے یہ سمدھی ایک بڑے آدمی ہیں۔ ان کا بیٹا اور میرا ہونے والا یہ داماد تقریباً ڈھائی لاکھ روپے ماہوار کماتا ہے۔ غیر ملکی کمپنی میں ایک بڑا افسر ہے۔ لہٰذا موجودہ سماجی ماحول کے اعتبار سے ان کے مطالبات بھی غیر معمولی ہونا چاہئے تھے، لیکن انھوں نے مجھے مطالبات، پُر تکلف کھانوں، غیر ضروری سامانِ جہیز اور تحائف کی لعنت سے بچالیا ہے۔ اس کا سارا کریڈٹ صلاح الدین صاحب اور ان کے بیٹے کو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اُن کے اس جذبہ کی تائید تالیوں سے کریں۔''

سارا پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ ابراہیم صاحب سمدھی کے کندھے پر ہاتھ رکھے رہے جن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ اُن کی گرفت میں اندر ہی اندر ایسے پھڑ پھڑا رہے تھے جیسے کسی چالاک شکاری کے ہاتھ میں کوئی کبوتر ہو۔ انھوں نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لانے کی ناکام کوشش کی اور ہاتھ ہلا کر تالیوں کا جواب بھی دیا۔

''میں صلاح الدین صاحب کے مومنانہ جذبہ کو محسوس کرتے ہوئے مہرِ فاطمی کی بھی تائید کرتا ہوں چنانچہ ہماری اس بیٹی کی شادی میں مہر دس لاکھ نہیں صرف بیس ہزار روپے ہی باندھے جائیں گے۔ میں درخواست کرتا ہوں قاضی صاحب سے کہ وہ نکاحِ مسنونہ کی تکمیل فرمائیں۔''

نکاح کے بعد عام شادیوں جیسے روایتی طعام سے نمٹ کر قیمتی تحائف، غیر معمولی جہیز اور' بے کار' براٹ رخصت ہونے لگی تو ابراہیم صاحب نے پہلے سے پیک کیا ہوا واجبی سامان گاڑی میں رکھوادیا پھر اپنے سمدھی اور داماد کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا، گلے ملے اور کہا ''ہماری بیٹی آسائشوں اور نازوں میں پلی ہے، اسے کسی قسم کی تکلیف نہ۔ ہم نے آپ کا قد اپنے مہمانوں کے سامنے قطب مینار سے بھی اونچا کردیا ہے اور یہ ہماری طرف سے وہ تحفہ

ہے جو آپ کے لئے حاصل کرنا آسان نہ ہوتا۔ ہمارے کہے کی لاج ضرور رکھ لینا۔ یہ بھی خیال رکھئے گا کہ ہم منتری وَنتری تو ہیں ہی..... مگر باہو بلی نیتا ابراہیم خاں بھی ہیں..... باقی آپ خود سمجھ دار ہیں.....اللہ حافظ۔

اور مولوی صلاح الدین برات لے کر کسی ایسے جواری کی طرح لوٹ آئے جو اپنی زندگی بھر کی کمائی ہار آیا ہو۔

❁ ❁ ❁

سبق

جب اختر عظیم صاحب کے بیٹے، نعیم اختر کا رشتہ، رحمن صاحب کی منجھلی بیٹی عصمت خانم کے لئے آیا تھا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اختر عظیم صاحب، بحیثیت استاد شہر بھی میں علم دوست، با اخلاق، مخلص اور ملنسار شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے۔ طلباء اور اُن کے سر پرستوں کے علاوہ محکمۂ تعلیم میں بھی ان کی فرض شناسی اور اپنی ذمہ داریوں کے تئیں ایمانداری کی بدولت خاصی عزت تھی، لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد جب انہوں نے تنظیم فلاح ملت بنا کر، اصلاح معاشرہ کا بیڑہ اُٹھایا تو عوام و خواص میں ان کا احترام خاصا بڑھ گیا۔ جو کام شہر کے علماء نہیں کر سکے وہ اختر عظیم صاحب نے مختلف مساجد اور مدارس میں اپنی تقریروں سے کیا۔ ان کی تقریروں کا انداز عالمانہ نہیں تھا لیکن اُن کے لہجے کا گداز اور رقت آمیز لہجہ، سننے والوں کے دلوں پر اثر کرتا۔ شادی اور غم کے مواقع پر بے جا رسوم، فضول خرچی بالخصوص پر تکلف کھانوں اور بے حد وحساب جہیز دینے یا مانگنے کی لعنت کو وہ تنقید کا ہدف بناتے۔ لوگ ان کی اس بے لوث اور مخلصانہ کوشش میں ہمنوا ہوتے گئے۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی بھی نہایت سادگی سے واجبی جہیز کے ساتھ کر کے عملی نمونہ پیش کیا۔ نعیم اختر ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ سی اے تھا اور با وقار تنخواہ پاتا تھا۔

رحمن صاحب خود بھی کوئی ایرے غیرے شخص نہیں تھے۔ خاندانی آدمی تھے، گوکہ اب نہ

ہی جاگیریں رہی تھیں نہ وہ دولت اور شان وشوکت، لیکن ماضی کے اثرات ان کی گفتگو اور طور طریقوں سے اب بھی جھلکتے تھے۔ وہ با اُصول تھے اور سخت مزاج بھی۔ اگر کسی مسئلہ میں کوئی فیصلہ کر لیتے تو اس پر قائم رہتے، خواہ وہ اُن کے حق میں بہتر ہوتا یا نقصان دہ۔ اختر عظیم صاحب کے بیٹے کا رشتہ انہوں نے منظور تو کر لیا تھا لیکن اس بات سے فکر مند بھی تھے کہ کہیں اپنی بیٹی کی حق تلفی کا مرتکب نہ ہونا پڑے۔ وہ اتنا کچھ دینا تو اپنا فرض تصور کرتے تھے جتنا وہ بڑی بیٹی کو جہیز میں دے چکے تھے اور جو اُن کی موجودہ حیثیت کے مطابق ہوتا کہ کسی کو اُنگلی اُٹھانے یا باتیں بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ مگر سوال اختر عظیم صاحب کے اُصولوں کا بھی تھا جو اُن کے سمدھی ہونے جا رہے تھے۔ انہیں یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ لوگ اُن پر اُنگلیاں اُٹھائیں کہ بیٹے کی شادی کے وقت ان باتوں کا پاس نہیں رکھا، جن کی تلقین وہ دوسروں کو کرتے ہیں۔ لیکن جب رحمٰن صاحب کو اُن کی بیگم نے سمجھایا کہ ''بیٹی آپ کی ہے آپ اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دیں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ آپ کا ایک مقام ہے، ایک عزت ہے، اپنے مہمانوں کی تواضع آپ کریں گے، اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ لڑکے والے آپ سے مطالبہ نہیں کر رہے ہیں، آپ کو خواہ مخواہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک ہفتہ بعد جب شادی کی تاریخ کے تعین کے لئے اختر عظیم صاحب اپنے دس بارہ اعزہ و احباب کے ساتھ تشریف لائے تو رحمٰن صاحب نے اپنی اس ذہنی خلش کا اظہار علیحدگی میں کیا اور اپنی بیگم کا مشورہ بھی بتایا۔ اختر عظیم صاحب نے کہا..... ''آپ کی بیگم نے بالکل ٹھیک فرمایا، وہ بہت سمجھ دار خاتون لگتی ہیں۔ بھائی جسے اللہ نے دیا ہے تو وہ اپنی بیٹی کو کیوں نہ دے!''

رحمٰن صاحب کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ جہاندیدہ شخص تھے، جہیز کی خواہش کے لئے یہ تائیدی جملے کافی تھے۔ تنظیمِ فلاحِ ملت کے روحِ رواں شخص کا باطن، ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا مگر جلد ہی اس خیال کو جھٹک دیا کہ انہیں تو یہ سب کرنا ہی تھا۔ مگر چند روز ہی گزرے تھے کہ اختر عظیم صاحب کا فون آ گیا۔ خیر و عافیت کے بعد نہایت ہوشیاری

سے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ برات کے کھانے میں کیا دیں گے۔ رحمن صاحب نے جواباً کہا ''جو آپ پسند فرمائیں مگر اختر صاحب نے بس اتنا ہی کہا کہ ''میرے مدعوئین شہر کے اکثر معزز حضرات ہیں، بس اُن کے شایانِ شان ہو۔ تا کہ ہم دونوں کی عزت رہ جائے۔'' رحمن صاحب کو یہ دوسرا جھٹکا لگا تھا، کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''میں آپ کی عزت اور وقار میں اضافے کی پوری کوشش کروں گا۔'' فون رکھنے کے بعد وہ شخصیت کے ظاہری اور باطنی تضاد پر بہت دیر تک سوچتے رہے۔

اور پھر انتہا تو اُس دن ہوگئی جب شادی سے ایک ہفتہ قبل اختر عظیم صاحب کی بیگم تشریف لائیں اور باتوں ہی باتوں میں فرمایا ''نعیم کی خواہش ہے کہ اس کے پاس بھی کار ہو۔ اس کے آفس کے زیادہ تر لوگ اپنی اپنی کاروں سے آتے ہیں۔ وہ خرید لیتا مگر ابھی نئی نئی ملازمت ہے، پھر شہر کی ایک معزز شخصیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہنے لگیں، وہ چاہتے تھے کہ نعیم کا رشتہ اُن کی بیٹی سے ہو جائے تو وہ کار بھی جہیز میں دے سکتے ہیں مگر ایک تو مجھے لڑکی کچھ زیادہ نہیں بھائی، دوسرے ہمارے شوہر ٹھہرے با اُصول انسان۔ وہ کہاں یہ بات پسند کرتے۔ مگر بچّوں کی اپنی خواہشیں ہوتی ہیں۔ انہیں بڑوں کے اُصولوں پر قربان تو نہیں کیا جا سکتا۔''

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جب وہ اپنی یا اپنے بیٹے کی فرمائش کا اظہار کر کے چلی گئیں اور رحمن صاحب کو بتایا گیا تو انہوں نے کہا ''ہم دھوکہ کھا گئے۔ بظاہر سونا نظر آنے والی شخصیت پر سنہری ملمع کیا ہوا ہے۔ یہ غالب کے اس شعر کے مصداق ہیں:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

ہم اس سلسلے کو یہیں ختم کر سکتے ہیں لیکن رحمن صاحب کی بیگم نے کہا ''ایسی بات منہ سے نہ نکالیں۔ ہم ہی مورد الزام ٹھہرائے جائیں گے، ہم ہی بدنام ہوں گے۔ لوگ سچائی کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے کیوں کہ اختر عظیم کی فلاحی تحریک کی ظاہری چمک دمک نے سب کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ خاموشی سے اپنی حیثیت کے مطابق

کام انجام دو۔ اگر بعد میں اُن کی جانب سے کوئی ردِ عمل سامنے آئے گا تو پھر اُن کی قلعی کھل جائے گی۔" بات سمجھداری کی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ رحمٰن صاحب نے شادی کی تیاری کی لیکن بہت غور فکر کے بعد..... اپنی عزت سے زیادہ اختر عظیم صاحب کی عزت کا پاس اور لحاظ کرتے ہوئے۔

آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا جب عصمت خانم اور نعیم اختر کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا تھا۔ رحمٰن صاحب نے کوٹھی کے باہر عین سامنے کے وسیع چوک کو قناتوں اور شامیانوں سے کورڈ کرا کر دو بڑے بڑے پنڈال بنوائے تھے۔ ایک میں نکاح کی تقریب ہونا تھی اور دوسرے میں طعام کے انتظامات کئے گئے تھے۔

بارات آ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سارا پنڈال شرکاء سے بھر گیا۔ نکاح خوانی کے لئے قاضی صاحب بھی مسند پر نوشہ کے برابر تشریف فرما ہو گئے۔ رحمٰن صاحب نے قاضی صاحب کے سامنے سے مائک اپنی طرف کیا اور گویا ہوئے۔

"معزز مہمانانِ گرامی!

میں آپ سب کو اپنی اور اختر عظیم صاحب کی جانب سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ سب کا تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں۔ آج کے دن یہ لمحات میرے لئے انتہائی مسرت کے ہیں، محض اس لئے نہیں کہ میں ایک فریضے سے سبک دوش ہو رہا ہوں بلکہ اس لئے بھی کہ میری رشتہ داری ایک ایسے با اُصول، باکردار اور عظیم شخص سے قائم ہو رہی ہے جس کی تعریف الفاظ میں کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے ظاہر و باطن سے سارا شہر واقف ہے۔ جس کی تنظیم فلاحِ ملّت کی تحریک نے عوام و خواص کے دلوں کو متاثر کیا ہے۔ جس نے نہ صرف اپنے اقوال سے معاشرے میں تبدیلی لانے کی کوشش کی ہے بلکہ جس نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی بھی انتہائی سادگی سے انجام دے کر ہمارے سامنے عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جب ہم بیٹیوں کی شادی کرتے ہیں تو عموماً جہیز کے بڑھتے ہوئے چلن اور دیگر رسوم کا، جن کو ہم اسراف کے سوا کوئی نام نہیں دے سکتے، رونا روتے ہیں لیکن

جب ہم بیٹوں کی شادی کرتے ہیں تو ہماری خواہشات اور بیٹی والوں سے توقعات بے حدو حساب ہوتی ہیں۔لیکن اختر عظیم صاحب واقعی عظیم انسان ہیں۔آج کی یہ تقریب اُن کے مقام کو بلند اور احترام میں اضافے کا موجب ہوگی۔میں نے حتی الامکان اسراف بے جا سے بچنے اور ان نقوش کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے جو انہوں نے اپنی بیٹیوں کے وقت قائم کئے تھے۔گوکہ میرے لئے یہ کام انتہائی مشکل اور اپنے آپ پر جبر کرنے کے مترادف تھا لیکن میں نے اختر صاحب کے مشن کو تقویت پہنچانے کے لئے یہ سب کیا اور مجھے خوشی ہے کہ میں اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔جب تک ہم جیسے لوگ اپنے ارمانوں اور خواہشات کی قربانی نہیں دیں گے تو سماج کے کمزور افراد کو کیسے تقویت ملے گی۔اب میں قاضی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایجاب وقبول اور خطبہ سے نکاح کی تکمیل فرمائیں۔''

نکاح ہو رہا تھا، اختر عظیم صاحب کی تعریف ہر زبان پر تھی، ہر دل ان کی عظمت کو سلام کر رہا تھا، لیکن وہ خود اپنی نظروں میں برہنہ تھے۔رحمٰن صاحب کی تعریف کا ایک ایک لفظ تیر بن کر اُن کی روح کو چھلنی کر رہا تھا۔جس خطاب کو سب اُن کی غیر معمولی تعریف سمجھ رہے تھے اس کی نشتریت کو وہ ہی محسوس کر سکتے تھے۔بظاہر وہ شرکا ر کی مبارک باد وصول کر رہے تھے۔لیکن اندر کا کرب اُن کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا، مگر اسے رحمٰن صاحب کے سوا اور کون پہچان سکتا تھا۔

ایسا ہی کھانا جو اختر عظیم صاحب نے اپنی بیٹیوں کی شادی میں کیا تھا اور کم وبیش وہی، واجبی جہیز، جو انہوں نے دیا تھا، رحمٰن صاحب کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔بارات رخصت کرتے وقت رحمٰن صاحب نے سمدھی سے بغل گیر ہوکر کہا ''اختر صاحب! آپ بیٹی لے کر جا رہے ہیں، بیٹی ہی کی طرح رکھئے گا۔انشاء اللہ میری بیٹی بھی ایک مثالی گھر کی مثالی بہو نہیں بیٹی بن کر رہے گی۔جو عزت اور وقار آپ کو اس شہر نے دیا ہے اور جس پر تصدیق کی مہر آج لگ گئی ہے، خیال رکھئے گا کہ کہیں ذرا سی لغزش سے پامال نہ ہو جائے.....میری بات آپ سمجھ رہے ہیں نا۔''

اور اختر صاحب کا جیسے سارا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ زبان گنگ تھی اور چہرے سے لگتا تھا کہ خواہشات کے سانپ اب انہیں اندر ہی اندر ڈس رہے ہیں۔ انہوں نے رحمن صاحب سے الگ ہوتے ہوئے کہا ''انشاء اللہ میں آپ کا یاد ہوا آج کا سبق یاد رکھوں گا۔

❁ ❁ ❁

مجھے معاف کردو

وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ شادی کا ایک سال خوشیوں کے گہوارے میں جھولتے اس طرح گزر گیا کہ پتہ ہی نہ چلا۔

اللہ نے اُن دونوں کو ایک ننھا منا کھلونا دے دیا۔ دونوں اُس سے کھیلتے۔ دنیا کی ہر خوشی اُس کی مسکراہٹ پر قربان کرتے۔ ہر تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ اب دونوں کی باہم فریفتگی کا وہ عالم نہیں تھا بلکہ دونوں کی توجہ اور دلچسپی کا خصوصی مرکز ایک ننھا منا وجود تھا۔

ایک سال بعد اُن کے دامن میں ایک خوبصورت سی گڑیا آ گئی۔ بیوی پر کام کا بوجھ بڑھا۔ دو ننھے منے بچوں کی پرورش اور گھر کے کام کاج نے پہلے سے کہیں زیادہ مصروف کر دیا۔ اس پر شوہر کے دبے دبے شکوے بھی بڑھنے لگے۔ وہ بچوں اور شوہر دونوں کی دیکھ بھال میں توازن قائم رکھنے کو پوری کوشش کرتی۔ اس طرح دو سال مزید گزر گئے۔

چوتھے سال قدرت نے انہیں ایک بچی سے نوازا۔ بیوی کی مصروفیات مزید بڑھ گئیں۔ دن بھر وہ گھن چکر بنی کچن، باتھ روم اور کمروں کے چکر کاٹتی رہتی۔ اُس کے مزاج میں جھنجھلاہٹ پیدا ہونے لگی۔ اب کبھی کبھی بڑبڑانے لگتی اور کبھی کسی بچے کو اس کی ضد پر جھنجھوڑ دیتی۔

ایسا نہیں تھا کہ شوہر اس کی مدد نہیں کرتا تھا۔ بچوں کو بہلانا اور گھر کے چھوٹے موٹے

کاموں میں ہاتھ بٹانا اُس کا روزانہ کا معمول تھا۔ باہر کے سارے کام اُسے ہی کرنا پڑتے تھے۔ ملازمت کے علاوہ مرد کے لیے باہر کے بہت مسائل ہوتے ہیں۔

لیکن بچّوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہی بیوی کے مزاج میں چڑچڑاپن، غصّہ اور بدکلامی بھی بڑھنے لگی۔ اب اگر شوہر کے دوست کبھی کبھار آجاتے اور وہ نشست گاہ سے دو چار کپ چائے فرمائش کر دیتا تو وہ منہ بسورتی اور بہت دیر تک بُدبُداتی رہتی۔ کسی بچّے کی ضد پر اس کی پٹائی کر دیتی۔ شوہر کے کام کو وہ اکثر ٹال جاتی یا کورا جواب دے دیتی اور وہ پیچ وتاب کھا کر رہ جاتا۔

ایک دن جب شوہر نے کہا ''صدف! میرا ایک بہت عزیز دوست کل آ رہا ہے۔ وہ دو دن یہاں رُکے گا۔ یہاں اُس کے اپنے رشتے دار ہیں۔ میری خواہش ہے کہ پرسوں کو میں اُسے مدعو کروں۔ اتوار بھی ہے میری چھٹّی ہوگی۔'' تو جیسے اُس کے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔

''ندیم صاحب! میں آپ کی بیوی ہوں، نوکرانی نہیں۔ آپ کو مجھ پر ترس بھی نہیں آتا کہ تن تنہا تین بچّوں اور ایک شوہر کے ناز نخرے سہہ رہی ہوں۔ دن بھر میں ایک گھنٹہ چین کا نہیں ملتا۔ رات بھر جو حال رہتا ہے وہ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ نے تو چادر تانی اور سو گئے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس پر رات بھر کیا گزری ہے۔ آدھا کام آپ کا ہے تو آدھا بچّوں کا ہے۔

اور وہ رو پڑی۔

عورت کا سب سے تیز دھار ہتھیار اُس کے آنسو ہوتے ہیں۔ ندیم کا غصّہ صدف کے آنسوؤں میں بہہ گیا۔ ورنہ آج وہ بھی اُس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا۔

ندیم نے خوشامد کی۔ ''صدف میری بات غور سے سنو، میری پریشانی کو سمجھو'' پھر اُس نے زانوؤں میں چھپا صدف کا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''صدف ڈارلنگ''! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم تو کبھی ایسی نہیں تھیں۔ یہ بات مجھے تسلیم کہ تمہیں سخت محنت کرنی پڑتی ہے مگر یہ سوچو کہ یہ سب کام عورتیں ہی تو کرتی ہیں۔ نوکر سب کو تو میسر نہیں ہوتے۔ یہ تو کل

تین بجے ہیں۔لوگوں کے تو آٹھ آٹھ بھی ہوتے ہیں۔ پھر میں بھی تو تمہارا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ دیکھو پرسوں کا پروگرام ہنسی خوشی گزار دو ورنہ میری بڑی انسلٹ ہو جائے گی۔''

ندیم نے صدف کے گال تھپتھپائے تو وہ مسکرادی اور ندیم تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔

....

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔

ایک دن صدف نے کہا''مرد واقعی ظالم ہوتے ہیں۔اپنی ہر خواہش پوری کرالیتے ہیں۔ اپنا ہر کام وقت پر چاہتے ہیں لیکن عورت کے مسائل کو نہیں دیکھتے۔ میں آپ سے نوکرانی کا مطالبہ اس لیے نہیں کرسکتی کہ مجھے معلوم ہے کوئی اضافی خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ میں سارے کپڑے بھی خود اسی لیے دھونا چاہتی ہوں کہ لگی بندھی تنخواہ کی وجہ سے آزمائش میں نہ پڑ جائیں۔اور آپ ہیں کہ ذرا رحم نہیں کھاتے۔''

ندیم نے سوچا کتنی معقولیت معلوم ہوتی ہے صدف کی باتوں میں، حالانکہ اس میں سب کچھ صحیح نہیں ہے۔خدا نے اُسے بہت سنجیدہ اور غیر جذباتی بنایا تھا۔وہ بولا''صدف تم نے بہت معقول باتیں کہی ہیں۔ مجھے کسی ایک سے اختلاف نہیں ہے۔تمہاری ہمدردی اور محبت کا حساب کوئی مجھ سے پوچھے۔تم شاید اتنا نہ بتا سکو، جتنا میں محسوس کرتا ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شادی کے بعد دو چار سال تک ایک خاص انداز سے گزرتے۔قدرت کی دین کہ اُس نے اپنی رحمتوں کی بارش ہم پر کی اور وہ سب کچھ دے دیا جس کے لیے لوگ منتیں اور مرادیں تک مانتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔مگر یہ بھی تو سوچو کہ جو تم کر رہی ہو وہ تمہیں ہی کرنا چاہیئے تھا اور جو میں کر رہا ہوں وہ میرا کام تھا اور ہے۔ہم دونوں ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ کیا دو پہیوں کی گاڑی ایک پہیئے سے چل سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔'' پھر کچھ توقف کے بعد اُس نے کہا''تم سمجھتی ہو کہ میں کچھ نہیں کرتا۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔تم خود جائزہ لو کہ تمہارے کتنے ہی کام میری مدد کے بغیر نہیں ہوتے۔ میں نے بھی تو دفتر کے علاوہ تمہاری مدد کرنے کو لازم سمجھ لیا ہے۔'' پھر اُس نے صدف کی ناک کو کھینچتے ہوئے مذاق کے موڈ

میں کہا۔"گزر گئی جیسی بھی گزری۔ اب بچے بڑے ہو جائیں گے تو تمہارا اور میرا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس وقت تو ہم دونوں کو ان کی اچھی پرورش اور تربیت کر کے جنت کمانا ہے۔ اچھا سو جاؤ۔"

ندیم نے دوسری جانب کروٹ لی اور جلدی سو گیا لیکن صدف گھنٹوں اُس کے ایک ایک جملے پر غور کرتی رہی۔ اور پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

....

چند ماہ اور گزر گئے۔ صدف کبھی تو نارمل ہو جاتی اور کبھی اپنے دل کی بھڑاس بچوں یا ندیم پر نکال دیتی۔ اور ندیم نے تو جیسے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ اکثر اُس کے غصے کا کوئی نوٹس نہیں لیتا اور بغیر ناشتہ کیے ہی دفتر چلا جاتا۔

اچانک ایک دن اُس کے ٹرانسفر کا آرڈر آ گیا وہ لکھنؤ سے میرٹھ چلا گیا۔

چلتے وقت اُس نے نصیحت کی"صدف! بچوں کا خیال رکھنا، اُن سے بدکلامی سے پیش نہ آنا۔ تمہارے اخلاق کا اثر بچوں پر بھی پڑے گا۔ اب یہ تم پر ہے کہ اپنے بچوں کو کس طرح کا بنانا چاہتی ہو۔ ویسے بھی اب تمہاری مصروفیات آدھی رہ جائیں گی۔"

مگر صدف ندیم کے کندھے سے سر ٹکا کر رو پڑی۔ ندیم نے بریف کیس ہاتھ میں لیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

....

ایک ماہ گزرا۔ پھر دوسرا بھی گزر گیا۔ ندیم نے تنخواہ منی آرڈر سے صدف کو بھیج دی۔ ندیم کے خطوط آتے رہے۔ صدف بھی برابر بچوں کی خیریت سے آگاہ کرتی۔ صدف کا ہر خط میں یہی مطالبہ ہوتا کہ جلدی ہی وہاں گھر تلاش کر لیجیے۔ میں اکیلے پن سے پریشان ہوں۔ مگر ندیم اس بات کا کبھی جواب نہیں لکھتا۔ آخر جب وہ جھنجھلا گئی تو ایک دن اُس نے کہا" آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ آپ مکان تلاش کیوں نہیں کرتے" تو ندیم نے لکھا۔

پیاری صدف!

ہمیشہ خوش رہو۔

تم مجھ سے کرائے کے مکان کا برابر مطالبہ کر رہی ہو جب کہ میں تمہیں اور بچّوں کو یہاں بلانا مناسب نہیں سمجھتا۔ تمہارے یہاں آنے سے میری اور تمہاری پریشانیاں بڑھ جائیں گی اور میں دانستہ ایسی غلطی کرنا نہیں چاہتا۔ بچّوں کی تربیت کا خیال رکھنا۔ اپنے آپ کو غصّے سے بچانا اور ہاں بچّوں کو میری طرف سے بہت پیار کرنا۔

فقط تمہارا

ندیم

''ہونہہ! بڑے آئے بچّوں سے محبت کرنے والے۔ تین ماہ گزر گئے اور اُنھیں دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ مرد سارے کے سارے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک دم پتھر۔'' صدف نے خط پڑھا اور میز پر پھینک کر کچن میں چلی گئی۔

رات کو جب بچّے سو گئے تو وہ خط لکھنے بیٹھی۔ جذبات سے اس کی کیفیت بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ الفاظ کے ہتھوڑے مار کر ندیم کو بھی اُسی طرح زخمی کرنا چاہتی تھی جس طرح ندیم نے اُسے کیا تھا۔

صدف نے خط شروع کیا چند سطریں لکھیں اور کاغذ پھاڑ دیا۔ کچھ دیر کھوئی کھوئی سی رہی۔ پھر خط شروع کیا اور پھر وہی کیا۔ بالآخر بستر پر پہنچ گئی۔

کچھ دیر بعد اچانک پھر اُٹھی اور میز پر پہنچ گئی اور خط لکھنے لگی۔

ندیم صاحب!

آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔

میں کس حال میں ہوں، آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ آپ کو اپنے بچّوں سے بھی کیا لینا دینا.....!

میں جانتی ہوں میرٹھ لکھنؤ سے اتنی دور نہیں ہے کہ آپ آ نہیں سکتے۔ لوگ دوسرے ملکوں سے آ جاتے ہیں۔ مگر آپ کو تو اللہ نے چین اور سکون دیا ہے۔ مجھ سے آپ کا پیچھا

چھوٹ گیا۔اب یہ خطوط رسمی ہیں۔ورنہ آنکھ اوٹ اور پہاڑ اوٹ۔

میں نے لکھا تھا مجھے وہاں بلا لیجئے تو آپ نے صاف انکار کر دیا کہ میری پریشانیاں بڑھ جائیں گی میں نے آپ کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ندیم صاحب! میں نے کہا تھا کہ آدھا کام آپ کا ہے جس کا طعنہ آپ نے چلتے وقت مجھے دیا تھا۔اُس وقت میں نہیں سمجھ سکی تھی مگر آج احساس ہوتا ہے کہ آپ اُسی بغض سے کام لے رہے ہیں۔وہی تو ہیں آپ جس نے کہا تھا کہ جب تک گاڑی کے دونوں پہیئے نہ چلیں گاڑی نہیں چل سکتی۔اب وہ کیا ہوا؟ کیا کسی گاڑی کے معقول پہیے الگ الگ کر دیے جائیں تو گاڑی چل سکتی ہے۔چلنا تو در کنار گاڑی گاڑی ہی نہیں رہ سکتی۔

ندیم صاحب! مجھے اپنی غلطیاں منظور۔لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرے ساتھ بچّوں کو بھی سزا دی جائے بچّے آپ کو کتنا یاد کرتے ہیں! بار بار معلوم کرتے ہیں کہ ممی ڈیڈی کب آئیں گے۔بتایئے میں کیا جواب دوں اُنہیں۔کاش قدرت ماں باپ کی مامتا میں توازن قائم کر دیتی تو آپ اتنا سخت دل تو نہ ہوتے۔

دیکھئے۔بچّوں کو اپنے پاس بُلا لیجئے۔مجھ سے ہاتھ جڑوائیں گے یا ناک رگڑوائیں گے۔آخر آپ کا مطلب کیا ہے۔

آپ کے بچّوں کی ماں

صدف

....

صدف کا خط ملنے کے بعد وہ کئی گھنٹے مسکراتا رہا۔رات تک کئی بار اُس نے خط پڑھ ڈالا۔اور تین دن بعد وہ لکھنؤ کے لیے روانہ ہو گیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو بچّے دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ندیم نے انہیں بے تحاشا پیار کیے۔صدف نے تو پہلے مسکرا کر اُس کا استقبال کیا پھر آنکھیں آنسوؤں سے جھلملانے لگیں۔وہ ندیم کے کندھے سے لگ کر خوب روئی۔

رات کو ندیم نے کہا ''صدف! تمہیں زبان کے ساتھ ساتھ قلم سے زخمی کرنے میں بھی کافی ملکہ حاصل ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے۔''

''کچھ بھی نہیں۔ تیزاب میں بجھا ہوا خط کسی اور نے لکھا ہوگا۔''

''میں بھی کیا کرتی جب آپ کا دل ہی نہیں پسیج رہا تھا۔''

''جب بدگمانیاں جنم لیتی ہیں تو اُسی طرح سوچا جاتا ہے جیسے تم نے سوچا۔

''میں نے بدگمانی کی۔ میں نے تہمت لگائی۔ ہاں بُری تو میں ہوں جیسے آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیوں چھوڑ گئے یہاں..... مجھے اور بچّوں کو۔'' وہ پھر جذباتی ہوگئی ''کیوں نہیں ڈھونڈا وہاں مکان؟ اسی لیے نا کہ کہیں مجھے بلانا نہ پڑ جائے۔ کہیں میں نہ آدھمکوں۔ بس دل بھر گیا مجھ سے۔'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''اری پگلی میں نے مکان کرائے پر لے لیا ہے اور تمہیں لینے ہی آیا ہوں۔

صدف آنسو دوپٹے کے پلّو سے پونچھتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''پہلے کیوں نہیں لیا۔

''اس لیے نہیں لیا تھا کہ میرٹھ کے حالات خراب تھے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ فساد اُس شہر کا مقدر بن گیا ہے۔ خود میرٹھ کے امن پسند لوگ دوسرے شہروں میں جا کر بس گئے ہیں۔ کاروباری اور نوکری پیشہ لوگوں کی تو مجبوری ہے۔ کتنے ہی ملازمین نے اپنی فیملی کو اپنے آبائی شہروں میں پہنچا دیا ہے۔ اور خود تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں۔'' صدف جیسے سُن ہو کر رہ گئی ہو۔ واقعی اُس نے کبھی اس طرف تو توجہ بھی نہیں کی تھی۔ وہ واقعی بدگمانی کا شکار تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ندیم نے کہا۔ ''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے چند مہینے ہوٹلوں کا کیسا کیسا کھانا کھایا؟ میرے کپڑے کس نے دھوئے ہیں۔ ناشتہ کرنے کتنی دور جانا پڑا ہے۔ وہ سارے کام جو تم کرتی تھیں کس نے کیے ہیں۔ میں نے بھی شکایت کی کہ تمہارے بغیر میں کتنا پریشان ہوں۔ تم نے ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا۔ اپنی ہی پریشانیوں کے بارے میں سوچا۔ اور میں؟ میں تو جیسے پتھر کا کوئی مجسمہ ہوں جس کی نہ اپنی ضرورتیں ہیں اور نہ کام۔''

''سوری ! آئی ایم سوری۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔'' صدف نے ندیم کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہا۔اُس نے دیکھا ندیم کی پلکوں پر بھی بلوریں موتی جھلملا رہے ہیں۔ اُس نے دوپٹے کے کونے سے اُنہیں صاف کرتے ہوئے کہا۔اب معاف بھی کیجئے نا۔ پلیز۔''

اب ندیم نے دوسری جانب کروٹ لے لی اور صدف نے اُسے گدا گدانا شروع کر دیا۔وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''صدف! میں پرسوں تمہیں یہاں سے لے کر جا رہا ہوں، اس لیے کہ تمہارا اصرار ہے۔شہر کے حالت کا بھی اللہ مالک ہے لیکن یہ سوچ لو کہ میرے ساتھ رہنے سے تم پر کام کا بوجھ بڑھ جائے گا۔ایک بار پھر پریشانی تم خود اپنے گلے میں ڈال رہی ہو۔اور ہاں.....''

صدف بپھر گئی اور دونوں ہاتھ کہنیوں تک جوڑ کر بولی۔''اللہ کے لیے ندیم مجھے معاف کر دو۔مت کرو اب اور زیادہ ذلیل۔ میں تو خود ہی شرمندہ ہوں۔ میں سب کچھ برداشت کرلوں گی مگر تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔''

تیسرے دن ندیم صدف بچّوں اور سامان کے ساتھ میرٹھ آ گیا۔مگر اُس نے صدف کو یہ کبھی نہیں بتایا کہ لکھنؤ سے میرٹھ تبادلہ خود اُس نے کرایا تھا۔اُس نے تو یہ بھی نہیں بتایا کہ اُس نے کرائے پر مکان بھی ڈیوٹی جوائن کرنے کے فوری بعد لے لیا تھا۔

❁ ❁ ❁

فیصلہ

میں بہت دیر سے شاہینہ بی کو تکے جا رہی تھی جو اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے ساتھ شادی کی اس تقریب میں محوِ گفتگو تھیں۔ چہرے پر سکونِ قلب، طمانیت اور خوش حالی کی صبح روشن تھی۔ آج وہ اپنی دو بہنوں، راحینہ بی اور فابینہ بی سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھیں۔ مدتوں مایوسی، تذبذب اور اضطراب سے متاثر رہنے والا چہرہ آج اپنی ہم عمروں سے زیادہ ممتاز تھا..... کچھ تو لڑکیاں تقریبات کے مواقع پر زیادہ ہی سج دھج کر شریک ہوتی ہیں اور عام زندگی سے زیادہ معیاری انداز و اطوار اختیار کرتی ہیں جس سے نسوانی حسن میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن خاندانی وقار، خوش خلقی، خوش حالی اور اطمینان بخش ازدواجی زندگی کسی بھی عورت کو قدرتی حسن سے آراستہ کر دیتی ہیں..... یہی شاہینہ بی اب سے دو سال پہلے تیس میں چالیس کی لگتی تھیں جو اب بتیس میں بیس پچیس کی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے سامنے دونوں بہنیں بچی لگ رہی تھیں جن کی شادیاں اس بنا پر شاہینہ بی سے پہلے ہوگئی تھیں کہ وہ زیادہ خوبصورت تھیں اور شاہینہ بی کا رنگ سانولا تھا۔ حالانکہ ناک نقشہ اُن کا بھی بڑا پُر کشش تھا۔ وہ سلیقہ مند ہنرمند اور سگھڑ لڑکی تھیں۔ اُن سے بات کرنے کے بعد کوئی بھی ان کا گرویدہ ہو سکتا تھا۔ زبان انتہائی شیریں اور لہجہ شائستہ تھا لیکن بہو اور بھاوج کی تلاش میں آنے والی بوڑھی اور جوان خواتین کے انتخاب کا معیار صرف ظاہری شکل و صورت تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ مات کھا جاتیں۔ ایسی عورتیں رشتوں کی منڈیوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لڑکیوں کو دیکھ کر یا تو رفو چکر ہو جاتیں

یا پھر چلتے چلتے شاہینہ بی کی چھوٹی بہنوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر جاتیں۔ جب شاہینہ کو اس کا علم ہوتا تو افسردہ ہو جاتیں۔ اپنی بے وقعتی پر کمتری کا احساس ہوتا اور پھر کئی دن بڑی بے دلی سے گزارتیں۔

شاہینہ بی کے والد سکندر علی خاں شہر کی معزز شخصیات میں شمار کیے جاتے تھے۔ لیکن چند سال قبل ان کا انتقال ہو چکا تھا اور اس خاندان کی سرپرستی اور کفالت کی ذمہ داری اب منور علی خاں کے سر تھی۔ جو اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ بہنوں سے بڑے تھے اور شادی شدہ تھے۔ والدہ اور تینوں بہنوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اخراجات و دیگر معمولات میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا۔ والدہ کی خواہش تھی کہ شادی پہلے شاہینہ بی کی ہو اور بعد میں چھوٹی بہنوں کی۔ کیوں کہ ایسا نہ ہونے پر بڑی بہن دوسرے رشتوں کے تعلق سے بھی سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ ہر ایک یہی سوچنے لگتا ہے کہ خدا جانے بڑی کی کیوں نہیں ہوئی؟ اس لئے اُسے بھی احتیاطاً بچنا چاہیے..... عمر گزر جاتی ہے اور ایک لڑکی سماج کی بے حسی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں جب چھوٹی بہنوں کے رشتوں کو والدہ نے منع کر دیا تو ایک دن شاہینہ بی نے ہمت کر کے ماں سے کہا کہ میری خاطر میری بہنوں کو کیوں نقصان پہنچا رہی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اُن کی شادیاں کریں۔ بھائی اور پھر دیگر اعزہ کا مشورہ بھی ایسا ہی تھا۔ لہٰذا منور علی خان نے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی نہایت وقار اور فراخدلی کے ساتھ انجام دی۔ دونوں بہنیں کھاتے پیتے گھرانوں میں گئی تھیں اور تین چار سال کے عرصے میں دو دو بچوں کی ماں بھی بن گئی تھیں۔

فاہینہ بی کی شادی کے ایک سال بعد ہی شاہینہ بی بھی ایک بلڈنگ کنٹریکٹر کی ماں کو پسند آ گئیں جو قریبی ضلع کے رہنے والے تھے۔ بات چیت اور پھر تحائف کا دور چلتے ایک سال بیت گیا۔ پھر ایک دن شاہینہ بی بھی بابل کے گھر سے رخصت ہونے کے لئے مائیوں بٹھا دی گئیں۔

مائیوں کے کونے میں ان کی سہیلیاں دن بھر ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ اور فلمی گیت

گاتی رہتیں اور شاہینہ بی زرد لباس میں انتہائی وقار کے ساتھ کنواری اور اکثر شادی شدہ سہیلیوں کے مذاق کا ہدف بن کر بھی مسکراتی رہتیں۔ کبھی شرما کر کسی کے نوچ بھی لیتیں۔

تین دن بڑے خوش گوار ماحول میں گذر گئے۔ آج بارات آ گئی تھی اور مرد شرکار طعام سے نمٹ کر شادی ہال میں جمع ہو رہے تھے جب کہ خواتین زنان خانے میں تھیں..... مگر اچانک یہ کیا ہوا؟ ایک دہشت ناک دھماکہ..... چاروں طرف دھواں ہی دھواں۔ پورا شادی ہال لرز اُٹھا..... زنان خانے کی چوکھٹ اور کھڑکیاں تک لرز اُٹھیں..... الفاظ کا بم پھٹا..... ''یہ شادی نہیں ہوگی۔ آپ لوگ برات واپس لے جایئے۔''

یہ الفاظ واقعی کسی بم سے کم نہیں تھے جو دُلہن کے سرپرست اور بڑے بھائی منور علی خاں نے ادا کئے تھے۔

کیوں؟..... آخر کیوں؟ ہر ہونق چہرے پر یہی سوال چپکا ہوا تھا۔ کچھ قریبی اعزہ نے منور علی خاں کو علیحدہ لے جا کر اس فیصلے کا سبب جاننا چاہا تو انہوں نے بتایا کہ دولہا پہلے سے شادی شدہ ہے۔ مزید استفسار پر انہوں نے بتایا ابھی دو صاحبان بائک پر انہی کے شہر کے آئے تھے۔ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر مجھے بلوایا اور یہ خبر دی۔ کہنے لگے ہم آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں اس لئے بتانے آ گئے۔ ہمیں یہ گوارا نہیں ہوا کہ کسی معصوم لڑکی کی زندگی دوزخ بنے۔ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا اب آپ کو اختیار ہے ہمیں اس شادی کا علم نہیں تھا۔ آج جب برات جانے لگی تو ہمیں حیرت ہوئی کہ ایک شادی شدہ شخص دوسری شادی کرنے کیوں جا رہا ہے..... یہ الگ بات ہے کہ پہلی شادی خفیہ ہے اور بہت کم لوگوں کے علم میں ہے۔ اس شادی کے بارے میں شاید اس شخص کی پہلی بیوی کو بھی نہیں معلوم ہے۔ میں نے تصدیق چاہی تو کہنے لگے تو پھر آپ نکاح پڑھوا دیجئے بعد میں تصدیق ہو ہی جائے گی، ہاں اگر ایک دن نکاح ٹال سکیں تو پھر ہم اس شخص کی پہلی بیوی کو ہی لا کر کھڑا کر سکتے ہیں۔

منور علی خاں سے تفصیلات سُننے کے بعد عزیزوں نے کہا ''ہمیں اس میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ نہایت شریف ہیں۔ دولہا بھی ایسا نہیں لگتا۔ بعض لوگ ذاتی دشمنی میں

بھی ایسی سازشیں کرتے ہیں۔ وہ لوگ یقیناً اُس کے بدخواہ ہوں گے۔ یہ بات دولہا کے سامنے اس کے والد کی موجودگی میں رکھنا چاہیے، پتہ چل جائے گا۔

نوشہ نے اس اطلاع پر حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کسی دوسری شادی سے صاف انکار کیا۔ اُس کے چہرے پر حیرانی تو تھی ہی اپنے بے قصور ہونے کا اطمینان بھی تھا۔ کسی مجرمانہ احساس کی جھلک کسی قول وفعل سے ظاہر نہیں ہورہی تھی۔

لڑکے کے والد نے اپنے حاسدوں کا تذکرہ کیا..... بہر حال سچ کیا تھا؟ فیصلہ کیا ہونا تھا؟ ہر چہرے پر یہ جاننے کے لیے سوالیہ نشان بنا تھا۔

بالآخر منور علی خاں کو ان کی والدہ نے زنان خانے میں بلایا اور بیٹے سے لپٹ کر روتے ہوئے بولیں..... منور! بہن کا نکاح پڑھوادو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ہم آج تو نکاح پڑھوادیں مگر کل شاہینہ بی سے آنکھیں چار کیسے کریں گے؟ ہم اُسے کیا جواب دیں گے؟ ہم اپنی بہن کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتے..... اور اگر خدانخواستہ یہ اطلاع صحیح ہوئی تو پھر دُنیا ہمیں کیا کہے گی..... یہی نا کہ باپ کے بعد بھائی نے بہن بہن کو وبال سمجھ کر جانتے بوجھتے دوزخ میں دھکیل دیا۔" "نہیں..... تم اس کی فکر مت کرو، شاہینہ بی بھی یہی چاہتی ہے۔ اُسے بھی قسمت کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ لیکن برات اُٹھ جانے اور شہر میں چہ میگوئیاں ہونے کی اذیّت کو وہ برداشت نہیں کرسکتی۔ میں اُسی کی رائے سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔"

"اماں! آپ ایک بار پھر اُس سے معلوم کرلیں..... کل کہیں وہ ہمیں الزام نہ دے۔"

"نہیں، تمہارے سر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ شاہینہ بہت سوجھ بوجھ کی لڑکی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اس وقت بھائی جان میری مامتا اور دُور اندیشی کی وجہ سے جذباتی فیصلہ کررہے ہیں جب کہ یہ محض کسی دشمنی میں پلاننگ سے کیا گیا اقدام ہے۔ وہ تم سے کبھی اس کی شکایت نہیں کرے گی۔ مگر وہ رشتوں کی منڈی میں اب مزید بکری کا مال بنی نہیں رہنا چاہتی جس نے اس کو نفسیاتی طور پر بہت نقصان پہنچایا ہے۔

''ٹھیک ہے'' منور علی خاں کسی ہارے ہوئے جواری اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح واپس لوٹے اور نکاح کی تیاری کی منظوری دے دی۔

شاہینہ بی بھی پی کے دیس رخصت ہو گئیں اور بہت جلد انہیں احساس ہو گیا کہ ان کا یہ فیصلہ نہایت دانشمندانہ تھا جس طرح کی افواہ سے انہیں اور ان کے شوہر کو رُسوا کرنے کی سازش کی گئی تھی اس میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ البتہ شاہینہ بی کے فیصلے نے سسرال میں اور بالخصوص شوہر کی نظر میں اُن کی عزت بہت بڑھا دی تھی کہ اُنہوں نے بروقت صحیح فیصلہ لے کر سارے خاندان کو ایک بڑی ذلت سے بچا لیا تھا..... کسی کی برات اُٹھ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

....

آج وہی شاہینہ بی میرے سامنے اپنی بہنوں سے محوِ گفتگو تھیں۔ کبھی افسردہ اور مایوس رہنے والی شاہینہ بی اب ایسے تروتازہ پیڑ کی مانند لگ رہی تھیں جسے نہ صرف مناسب فضا ملی ہو بلکہ جس کی وقت پر آبیاری بھی ہو رہی ہو..... اُن کے چہرے ہی نہیں بلکہ سارے جسم سے مسرّت اور شباب کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں..... ویسے بھی وہ اُس خوشگوار دور سے گزر رہی تھیں جس کی تمنا ہر عورت کو ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

دہشت کے حصار میں

انوار صاحب عصر کی نماز کے لئے گھر سے نکل کر چوک تک آئے تو گلی کے کئی لڑکوں کو کسی بم دھماکے پر گفتگو کرتے پایا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رُکے تو اُن میں سے ایک نے کہا ''انکل سبزی منڈی میں بم دھماکہ ہو گیا ہے۔''

''یہ بات تم سے کس نے کہی؟ میں تو کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے آیا ہوں۔''

''ایک لڑکا جو سڑک کے پار رہتا ہے، اُسی نے بتایا۔ میں اسے جانتا ہوں۔'' وہ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ سائیکل سے بہت تیز رانی پور سبزی منڈی گیا ہے جیسے اُس کا کوئی اپنا وہیں ہو اور اس کی خبر گیری کے لئے جا رہا ہو۔'' گلی کے لڑکے نے بتایا۔

''افواہ ہے یہ ..... میں تو اسکول سے لوٹتے وقت وہاں سے سبزی لے کر آیا ہوں .....ہونہہ'' اتنا کہہ کر وہ مسجد کی جانب بڑھ گئے۔

مسجد سے باہر نکلے تو پھر بم بلاسٹ کی بات یاد آ گئی اور وہ سوچنے لگے لوگوں کو افواہیں گھڑ کر خوف و دہشت پھیلانے میں مزہ آتا ہے کیسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں ہم لوگ ..... افواہوں سے ظاہر ہونے والے نتائج پر سنجیدگی سے کبھی غور نہیں کرتے ..... مگر وہ ابھی چند قدم ہی اپنے گھر کی جانب بڑھے ہوں گے کہ محلّے کے ایک معمر اور سنجیدہ شخص نے کہا..... ''بھئی انوار صاحب! رئیس احمد سبزی فروش بم دھماکہ میں ختم ہو گیا۔''

''کیا! کیسا دھماکہ؟'' انوار صاحب نے حیرانی کا مظاہرہ کیا اور فوراً ہی ذہن چوک میں کھڑے لڑکوں کی اطلاع پر گیا، جسے انھوں نے افواہ سے تعبیر کیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ خود وہاں تھے اگر یہ بلاسٹ اس وقت ہو جاتا تو.....ایک انجانے خوف نے جیسے اُن کے دل کو مضبوطی سے جکڑ لیا ہو.....وہ سُن ہو کر رہ گئے۔

''ارے بھائی کہاں کھو گئے؟ کیا میری بات پر یقین نہیں آرہا ہے۔؟''

''نہیں نہیں.....آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟۔''

''ارے بھائی ایسی خبریں بہت جلد پھیل جاتی ہیں اب اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ کیسے معلوم ہوا یہ سانحہ۔ جاؤ دیکھو نا سامنے گلی میں رئیس احمد کے یہاں کیسا کہرام بپا ہے۔ اور اب تو بریکنگ نیوز میں یہ خبر ٹی وی پر آ چکی ہے۔'' انوار صاحب کچھ نہیں بولے اور وہ صاحب کہتے رہے..... ''یہ آدھے پون گھنٹے کا واقعہ ہے کسی نے بم رکھ دیا، وہ پھٹ گیا اور کئی لوگ ہلاک ہو گئے.....زخمی بھی ہوئے ہیں کچھ لوگ۔'' اُن صاحب نے بات پوری کی۔

انوار صاحب میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ رئیس احمد کے گھر تک جاتے.....اُنھیں تو اپنا گھر پکڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ دل کی کیفیت عجیب سی تھی۔ احساسِ شکرِ خداوندی کے باوجود خوف کا ایک بھاری پتھر جیسے اُن کے حرکتِ قلب کو بند کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُنھوں نے ٹوپی اُتار کر سرہانے رکھی اور لیٹ گئے.....یہ اُن کا روز کا معمول بھی تھا۔ چار بجے تک اسکول میں رہ کر جب وہ واپس لوٹتے، اور رانی پور سبزی منڈی سے ترکاری خریدتے ہوئے آتے تو عصر کی جماعت کا وقت ہو چکا ہوتا۔ نماز سے فارغ ہو کر ہلکا پھلکا ناشتہ کرتے اور کچھ دیر آرام۔

بیوی نے چائے کا کپ اور سلائس کی پلیٹ اُن کے پاس رکھتے ہوئے ''چائے لے لیجئے'' کہا تو انھوں نے کہا ''جی نہیں چاہ رہا ہے.....اسے لے جاؤ۔''

''کیا بات ہے.....کچھ طبیعت ناساز ہے؟۔''

''نہیں''.....انھوں نے آنکھیں بند کئے اور ماتھے پر کلائی رکھے ہوئے جواب دیا۔

''کیا اسکول والوں نے ملازمت سے الگ کر دیا؟۔''

''نہیں''

''تو پھر کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔'' بیوی نے مزید کریدا۔ کیوں کہ آج اُن کی طبیعت خلافِ معمول محسوس ہو رہی تھی..... ''کچھ بتایئے تو.....!''

''بیگم آج اللہ نے ہماری جان بچا دی۔''

''ہائے اللہ..... جبھی تو کہوں آج آپ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی ہیں؟ مگر ہوا کیا؟۔''

''بتاتا ہوں بیگم.....'' انوار صاحب نے بیٹھتے ہوئے کہا..... ''میں اسکول سے آتے ہوئے سبزی منڈی سے سبزی خرید کر لایا ہوں۔ میرے آنے کے فوری بعد وہاں بم بلاسٹ ہو گیا۔ کئی لوگ موقعِ واردات پر ہی مر گئے۔ بہت سے زخمی بھی ہیں۔''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے آپ کو بچا لیا۔ اس پر تو آپ کو بھی اُس کا شکر گذار ہونا چاہئے۔'' بیوی نے تسلی دی۔ ''کسی غریب کو کچھ صدقہ ضرور دید یجئے گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے بیگم! مگر میرا دل یہ سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا ہے کہ اگر میں بھی وہاں ہوتا تو.....!''

''لاحول ولاقوۃ..... آپ بھی خوب ہیں بجائے خوش ہونے کے دہشت کے اسیر ہیں..... اُٹھئے اور چائے لیجئے..... آپ مرد ہیں۔ اپنے اعصاب پر قابو رکھئے اور اپنا ذہن اس طرف سے ہٹائیے۔''

بیوی کے اس قدر سمجھانے پر چائے تو جیسے تیسے لے لی مگر رات کا کھانا نہیں لیا..... بس خبریں سنتے رہے اور ناحق کے اندیشوں اور لاحاصل کرب میں مبتلا رہے۔

ٹی وی پر موقعِ واردات کی تصاویر دکھائی جا رہی تھیں۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ بم کسی سائیکل کی کنڈیہ میں رکھے ناشتہ دان میں تھا جو ریموٹ کنٹرول سے بلاسٹ ہوا۔ خبروں میں یہ بھی بتایا گیا کہ پولس ایک مشتبہ دہشت گرد کا سراغ لگا رہی ہے جو ادھیڑ عمر کا شخص تھا اور

لال شرٹ پہنے تھا۔

انوار صاحب تو یہ سن کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ پہلے ہی کیا کم حواس باختہ تھے کہ اس انکشاف نے آگ پر تیل کا کام کیا..... ''نور جہاں! نور جہاں، دیکھو ٹی وی میں کیا آ رہا ہے؟''۔ انھوں نے کسی معصوم بچّے کی طرح اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے.....نور جہاں ہم قسم کھاتے ہیں کہ بم ہم نے نہیں رکھا.....یقین کرو ہمارا بم دھماکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''کس نے کہا آپ کا تعلق ہے؟ یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟ پسینے میں شرابور ہو رہے ہیں.....اپنے آپ کو سنبھالئے۔''

''ابھی ٹی وی پر بتایا ہے کہ جس آدمی نے بم بلاسٹ کیا ہے وہ لال شرٹ پہنے تھا۔ پولیس اُس کی تلاش میں ہے سارا حلیہ تو ہمارا ہی ہے۔ ہم بھی تو لال شرٹ پہنے تھے۔ ہماری سائیکل میں بھی تو کنڈیہ لگی ہے جس میں ہم ٹفن رکھتے ہیں.....اور.....''

''تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بم آپ نے رکھا ہے اور پولس آپ کو ڈھونڈ رہی ہے؟'' بیوی نے کہا اور وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی..... ''یا اللہ! میری قسمت میں کیسا مرد لکھا تھا جو عورت سے بھی زیادہ کم ہمت اور کم عقل ہے۔'' وہ رونے لگی۔

''نور جہاں، میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ لال شرٹ میری عمر اور مزاج کے آدمی کے لئے مناسب نہیں ہے مگر تم نے ہمیشہ یہی کہہ کر میری بات کو رد کر دیا کہ ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہو۔ یہ شرٹ اچھی لگتی ہے۔''

''یہ پاگل پن کی باتیں مت کرو ورنہ میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔'' بیوی نے دوٹوک انداز میں کہا تو انوار صاحب بولے ''اچھا تم یہ شرٹ ابھی جلا دو۔ اگر پولس کو مل گئی تو خواہ مخواہ میرے خلاف ثبوت ہاتھ آ جائے گا۔''

''میرے اللہ! میں کیسے سمجھاؤں کہ تم دہشت گرد نہیں ہو۔ تمہارا بم بلاسٹ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' پھر بیوی نے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا..... ''لو یہ ٹھنڈا پانی پیو اور تسلی سے میری بات سنو۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ تمہارا جو جی چاہے کرتے رہنا اور اپنی

حماقتوں سے خود کو مجرم ثابت کر لینا۔" وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ میں آپ سے تم پر اُتر آئی تھی۔

"اچھا بتاؤ"..... انوار صاحب نے نہایت معصومیت اور بے بسی سے کہا۔

"تم نے ابھی سنا کہ سائیکل کی کنڈیہ میں ناشتہ دان تھا جس میں بم رکھا تھا۔ وہ پھٹ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں سائیکل بھی ہوگی اور ناشتہ دان بھی۔ اس کے ٹکڑے یقیناً پولیس کے ہاتھ آئیں گے..... جب کہ تمہاری سائیکل اور ناشتہ دان تمہارے پاس صحیح و سالم ہے۔ تم اسے دکھا سکتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی واردات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک بات ہے۔" انوار صاحب نے بیوی کی تائید کی۔

"رہی بات لال شرٹ کی..... تو آجکل سبھی پہنتے ہیں۔ سائیکلوں میں اپنی سہولت کے لئے کیریر، کنڈیہ اور دوسری چیزیں سبھی لگاتے ہیں..... اسکول جانے والے، دفتروں میں کلرکی کرنے والے اور مزدور، سبھی ناشتہ دان لے کر نکلتے ہیں تو کیا وہ سب اس واقعہ کے بعد خود کو دہشت گرد سمجھنے لگیں..... اور سبزی منڈی سے بھی امیر غریب سبھی خریداری کرتے ہیں۔ اپنے دل سے ناحق کا خوف نکالو اور آرام سے لیٹ کر میری باتوں پر غور کرو۔ مرد اتنے ڈرپوک نہیں ہوتے جتنے تم ہو..... اب میں کھانا بنانے جا رہی ہوں۔" نور جہاں اگرچہ معمولی پڑھی لکھی عورت تھی مگر نہایت عمدگی سے شوہر کو سمجھایا۔

انوار صاحب کے دل سے خوف پھر بھی دُور نہ ہوا۔ ذرا سا پتہ کھڑکتا تو اُن کا دل دھڑکتا۔ وہ انجانے خوف سے ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے..... کبھی ٹی وی اور ریڈیو پر خبریں سنتے اور دیکھتے، کبھی لیٹ جاتے۔ بیوی اُن کی ساری کیفیت دیکھ رہی تھی پریشان تھی اس کا سمجھانا بالکل بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔

"لیجئے..... دودھ پی کر سو جایئے۔ نیند ہو جائے گی تو ذہن کا بوجھل پن ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ صبح اسکول جا کر پڑھائیں گے کیسے؟"

"میں اسکول نہیں جاؤں گا نور جہاں..... میں پولس کی نظروں میں نہیں آنا

چاہتا۔"

"ٹھیک ہے، مگر سبزی تو آپ ہی لائیں گے نا!" بیوی نے منہ پھیر کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم برہم ہو گئے..... "بکواس مت کرو نور جہاں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ دودھ پی کر سو جایئے۔"

"اچھا میں خبریں سُن لوں۔" انوار صاحب نے معصوم بچّے کی طرح التجا کی۔

"نہیں، اب صبح سننا۔ میں لائٹ بند کر رہی ہوں۔"

انوار صاحب نے دودھ کا گلاس خالی کر کے تپائی پر رکھا اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کچھ ہی دیر میں سو بھی گئے کیوں کہ دودھ میں گھلی نیند کی گولیوں نے اپنا کام کر دیا تھا۔

صبح جب وہ بیدار ہوئے تو آٹھ بج رہے تھے۔ فجر بھی قضا ہو گئی۔ انھوں نے زیرلب کہا۔ مقامی اخبار سرہانے رکھا تھا۔ "بم بلاسٹ کا ملزم گرفتار" پہلے صفحہ پر ہی یہ خبر شائع کی گئی تھی۔

متن میں لکھا تھا رات ساڑھے بارہ بجے شہر سے چند کلومیٹر دُور گوپال گنج کے چیک پوسٹ پر پولس کو مستعد دیکھ کر ایک بائک سوار جیسے ہی بائک موڑ کر پلٹا، پولس نے اس کا تعاقب کیا۔ گھبراہٹ میں سڑک کے درمیان بنے ڈیوائڈر سے ٹکرا کر گر گیا اور پولس نے اُسے گرفتار کر لیا۔ ابتدائی تفتیش میں ہی اُس نے سبزی منڈی میں بم بلاسٹ کرنے کا جرم قبول کر لیا۔

"نور جہاں..... نور جہاں! اُٹھو، دیکھو ملزم پکڑا گیا۔" انوار صاحب نے بیوی کو جگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کب کہا تھا نہیں پکڑا جائے گا؟ آپ ہی بے قضا کے جان دے رہے تھے۔ اب اطمینان سے سو جایئے اور مجھے بھی سونے دیجئے۔" اور وہ سرتاپا چادر لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

''بھئی واہ! تم کیسی عورت ہو، اتنی اہم خبر نہیں پڑھ رہیں۔''

''اب آپ ہی پڑھتے رہیں۔ میں پہلے ہی پڑھ چکی ہوں۔ اخبار میں نے ہی تو لا کر آپ کے سرہانے رکھا تھا..... ساری رات جاگتے گزری ہے۔ اب تو سونے دیجئے۔''

''اچھا چائے تو بنا دیجئے۔''

''جب اسکول جانا نہیں ہے تو دیر سے پی لیجئے گا۔''

''اسکول کیوں نہیں جانا ہے..... ہم جائیں گے۔ ہمارا لفن بھی تیار کرنا ہے آپ کو۔''

.....اور جب ساڑھے نو بجے انوار صاحب اسکول کے لئے نکلے تو بیوی سے پوچھا..... ''آج سبزی کیا لائیں؟'' اور بیوی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تو وہ معصومیت سے بولے ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟۔''

''میں خوش ہو رہی ہوں اپنے میاں کی ہمت اور بہادری پر۔ میں کل اور آج کے فرق پر ہنس رہی ہوں..... جائیے، اللہ حافظ۔''

❁ ❁ ❁

انتظار

ارمان کی پرورش اس کی ماں ریشماں کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ اس لئے اس کی تربیت اور ذہن سازی بھی انہی کی نگرانی میں ہوئی۔ لہٰذا اس کے ذہن میں باپ کی وہی بدنما تصویر مرتسم ہوگئی جو اُس کی ماں نے اس کے سامنے پیش کی۔ باپ اور سوتیلی ماں سے نفرت کا سبق اُسے پالنے (جھولے) میں ملا تھا جو سنِ بلوغ کو پہنچنے پر بھی وہ نہ بھولا۔ کبھی اس نے والدین کے ماضی کو جاننے اور حالات کا تجزیہ کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے مدارج ضرور طے کر رہا تھا مگر محض معاشی نقطۂ نظر سے..... مستقبل میں خوش حال زندگی اُس کے پیشِ نظر تھی۔ رشتوں کے تعلق سے اس کے ذہن و دل میں نہ کوئی وسعت پیدا ہوئی اور نہ ہی دینی اور اخلاقی تعلیم سے کوئی واسطہ رہا۔ وہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہا اور باپ کے تئیں تمام تر نفرتوں کے باوجود بھی موقع بموقع اُن سے مدد حاصل کرنا اپنا حق سمجھتا تھا..... دراصل وہ ایک خودسر، ضدی اور خودغرض فطرت کا نوجوان تھا۔ محبت، ہمدردی اور احترام ممکن ہے کسی کے لئے ہو مگر ضیا خان کے لئے بالکل نہیں تھا۔

ضیا خان کو بیوی کے تسلیاں دینے اور خوش آئند مستقبل کے خواب دکھانے سے دل کے بوجھ میں کمی تو محسوس ہوئی لیکن وہ ارمان کی گفتگو کو بالکل فراموش نہیں کر سکے۔ رات کو جب بستر پر لیٹے تو اس کے کہے ہوئے سارے جملے خار بن کر اُن کے دماغ اور دل میں چبھنے لگے۔

''میں نے صرف یہ معلوم کرنے کے لئے فون کیا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟۔''

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اُس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا.....اس کے باوجود آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھے بلانے کی۔''

''میں آپ سے قطعی ملنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے آپ وہی کہیں گے جسے میں زندگی بھر قبول نہیں کرسکتا۔''

ضیاء خان تادیر چھت کو تکتے رہے، کروٹیں بدلتے رہے اور ارمان کے زہر میں بجھے ہوئے فقروں کی بازگشت جاری رہی.....

''ارے آپ سوئے نہیں۔'' بیوی کی رات گئے آنکھ کھلی تو اُس نے پوچھا۔

''نیند نہیں آرہی ہے۔''

''آپ ٹیلی فون کی گفتگو سے اس قدر بے چین ہوگئے..... پہلے تو کبھی آپ نے دل پر اتنا اثر نہیں لیا۔ چھوڑیئے بچّوں کی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیتے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شوکیہ۔ مگر ارمان اب بچّہ نہیں ہے، وہ شادی شدہ ہے اور معاشرے کا ایک ذمّے دار فرد۔ ہم اب تک اس اُمید پر جی رہے تھے کہ چونکہ بچپن اور نوعمری کا زمانہ اُس نے ماں کے زیرِ سایہ گزارا ہے اس لئے ہمارے تعلق سے اس کے اندرون میں جو زہر بھرا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ زائل ہوجائے گا مگر وہ گھر سے دُور یونیورسٹی میں رہ کر بھی ویسا ہی رہا۔ ہم سے مدد طلب کی۔ ہم نے اپنی مامتا کا اظہار کیا اور اپنی کم مائیگی کا بھی احساس نہ کرتے ہوئے بار بار اس کی دلجوئی، حوصلہ افزائی اور مدد کے لئے پہنچے۔ اپنی حیثیت کے مطابق جو کچھ کرسکتے تھے کیا مگر اس نے تو اس وقت بھی ہماری شفقت اور محبت کا جواب زہر میں بجھے فقروں سے دیا.....اس نے کبھی بے غرض ہوکر ہمیں فون نہیں کیا۔ کبھی سلام نہیں کیا۔ ہم سے خیریت نہیں پوچھی۔ اپنا مدعا بیان کیا۔ اپنی طلب کا اظہار کیا، وہ بھی کرخت یا طنزیہ لہجے میں، اور ہماری روح تک کو زخمی کردیا.....''

شوکیہ نے شوہر کے بالوں میں انگلیاں گھماتے گھماتے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''آپ سوجایئے اب۔''

''نیند تو سکون کی حالت میں آتی ہے۔ اگر دل میں خلش ہو تو پھر نیند کیسے آسکتی ہے.....؟'' پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے ..... ''ماہ پارہ!'' انھوں نے مدتوں بعد اُس کا اصلی نام لیا تھا..... ''ماہ پارہ! تمھیں یاد ہے کہ ہمارے عزیز ترین دوست نے اس تعلق سے سارے حالات جان کر جو تجزیہ کیا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے مگر.....''

''ہمیں ان کے مخلصانہ تجزیے کو محسوس کر کے عمل کرنا چاہئے تھا اگر ہم ایسا کرتے تو آج نوبت یہاں تک نہیں آتی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ارمان نہ آج تمہارا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا..... تمہاری یک طرفہ قربانی لاحاصل ثابت ہوگی۔ وہ ایک خودغرض انسان ہے اور پورے شعور کے ساتھ اس عورت کا انتقام لے رہا ہے..... جو اُس کی ماں بھی ہے اور اس سے انتقام لے رہا ہے جو اس معتبر عورت کا نوعمر شوہر ہی نہیں رہا بلکہ اس کا باپ بھی ہے..... یہ جانے بغیر کہ اس کی ماں نے اس کے باپ کی خدمتوں اور ہمدردیوں کے صلے میں ایموشنل بلیک میلنگ کے ذریعے اپنی بیوگی کی بوسیدہ چادر اُتار پھینکی تھی اور اسے سماج میں ایک ایسے چوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جہاں ہر سمت سے تہمتوں کے پتھر اُس کے نوعمر وجود کو زخمی کر رہے تھے۔ ارمان نے ہمیشہ یک طرفہ کہانی سنی اور یقین کیا..... حالانکہ وہ ایک ایسا ذریعہ تھا جو فاصلوں کو کم کرنے میں معاون ہوسکتا تھا۔ ہاں، آپ سے تعلق کی بحالی کی ایک موہوم سی امید اسی وقت ممکن ہے جب موجودہ سہارا ختم ہو جائے اور سوتیلے رشتے اپنا رنگ دکھانے لگ جائیں۔''

''آپ کے دوست نے بالکل ٹھیک کہا تھا میں یہ مانتی ہوں مگر اب تو سحر ہونے کو ہے'' ماہ پارہ نے نم آنکھوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب سو جائیے کچھ دیر کے لئے ہی آنکھ لگ جائے گی تو کل آفس میں کام کر سکیں گے۔''

''ٹھیک ہے کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔'' ضیار خان نے کہا اور دوسری سمت کروٹ لے کر واقعی سونے کی کوشش کرنے لگے۔

اگلی صبح ضیار خان آفس چلے گئے۔ دن بھر وہ اپنے ظاہری وجود کے ساتھ اپنی کرسی

پر موجود رہے۔ میز پر فائلیں بھی کھلی رہیں لیکن اعضائے جسمانی کو کنٹرول کرنے والا دماغ تو کہیں اور تھا.....

''میں آپ سے قطعی ملنے کا خواہش مند نہیں ہوں''۔

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اُس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا اس کے باوجود آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھے بلانے کی۔''

''مجھے معلوم ہے آپ وہی کہیں گے جو میں زندگی بھر قبول نہیں کرسکتا۔''

''میرے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔؟''

سوالات کے آکٹوپس نے اپنے نوکیلے پنجوں سے ان کے دماغ کو پوری طرح جکڑ لیا تھا..... ''ہونہہ''..... انھوں نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر کہا اور خود کلامی کرنے لگے.....

'میرے لئے دل میں کوئی گنجائش نہیں ..... میری ایک بات ماننے کے لئے تیار نہیں ..... اندازِ گفتگو انتہائی حقارت آمیز ..... اور مجھ سے امداد کی طلب ! اور وہ بھی ایسے ہی تیوروں کے ساتھ ..... جو قطعہ زمین وراثت میں میرے حصّے میں آرہا ہے اس پر نظر ..... اور میں اپنی باقی ماندہ زندگی کرائے کے مکانوں میں گزار دوں۔ نہ خوفِ خدا اور نہ خوفِ آخرت ..... فرائض سے غافل اور حقوق کی طلب ..... میں نہیں دوں گا وہ زمین جو ٹیلی فون کرنے کا موجب ہوتی ہے۔

ضیار خان نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے فیصلہ لیا اور فائلیں بند کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نیچے کینٹین میں انھوں نے چائے اور سینڈوچ لئے کیوں کہ آج ٹفن ساتھ نہیں لائے تھے۔ کچھ دیر اخبار کا مطالعہ کیا اور اپنی ٹیبل پر واپس آگئے۔ اب وہ خود کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔'

شوہر کو نارمل دیکھ کر ماہ پارہ کو دِلی سکون محسوس ہوا۔ وہ دن بھر نہ صرف فکر مند رہی تھیں بلکہ اللہ سے دُعا بھی کرتی رہی تھیں کہ وہ جلد از جلد نارمل ہو جائیں۔ انھوں نے سوچ لیا

تھا کہ اب وہ اس تعلق سے کوئی ذکر نہیں آنے دیں گی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی ماہ پارہ نے ریموٹ ضیار خاں کو دیتے ہوئے کہا....''لیجئے آپ خبریں سن لیجئے۔''

''خیر تو ہے.....یہ وقت تو آپ کے پسندیدہ سیریل کا ہے۔''

''وہ میں کل دن میں دیکھ لوں گی۔ اسے تو ریپیٹ ہونا ہی ہے۔''

''مگر یہ بات تمہیں آج معلوم ہوئی؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ایک تو موقع ملتا تھا نوک جھونک کا۔ وہ بھی تم نے ہم سے چھین لیا اور ماہ پارہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئیں اور سنک میں پڑے برتنوں کو دھو کر اسٹینڈ میں لگانے لگیں۔

''ارے بھئی شوکیہ موبائل بول رہا ہے۔'' ماہ پارہ جلدی جلدی ہاتھ دھو کر کمرے میں داخل ہوئیں.....''ہلو'' انھوں نے کہا لیکن لائن ڈسکنکٹ ہوگئی۔

''لیجئے کٹ گیا۔ اسے آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔'' انھوں نے فون ضیار خان کو دیتے ہوئے کہا۔

فون ارمان کا ہی تھا جس نے سوتیلی ماں کی آواز سنتے ہی کاٹ دیا تھا.....ضیار خان نے مس کال دیکھتے ہوئے غصے سے ہنکار بھری، پھر استہزائیہ انداز میں مسکرا کر سر کو جنبش دی کچھ ہی وقفے سے موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔

''السلام علیکم۔'' ضیار خان نے موبائل میں نام دیکھ کر بیٹے کو سلام کیا۔

''وہ میرے بارے میں کیا سوچا۔؟''

''نہ سلام کی توفیق نہ جواب دینے کی زحمت! کس سے بات کر رہے ہیں آپ؟'' ضیار خان نے کرخت لہجے میں کہا۔

''آپ سے.....اپنے باپ سے اور کس سے؟''

''باپ.....کیسا باپ۔ باپ کو سلام علیک نہیں کرنا چاہئے۔؟''

دوسری جانب سے خاموشی رہی۔

''یہی سکھایا گیا ہے تمہیں بے ہودہ کہیں کے .....اولاد ایسی ہی ہوتی ہے جیسے تم ہو؟ شرم آتی ہے یہ سوچ کر۔ باپ کے تئیں کوئی ذمّے داری نہیں ہے تمہاری، اپنے سارے فرائض بھولے ہوئے ہو۔''

''میری بات سنئے .....میری بات.....''

''نہیں سننا ہے کچھ مجھے۔ بہت سن لیا میں نے.....اپنی بات اُسے ہی سناؤ جس نے تمہیں دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے میرے خلاف تمہارے اندر زہر بھرا ہے۔ تم نے یک طرفہ کہانیاں سُن کر جو فیصلہ کیا تھا اس پر اب بھی قائم ہو.....تم نے مجھ سے بھی کبھی پوچھا کہ میں کن حالات سے گزرا ہوں۔ تمہاری ماں نے میری بے لوث خدمتوں کا کیا صلہ دیا.....کبھی حقائق کو جاننے کی خواہش تمہارے اندر کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ تم فون کرتے ہو اپنی غرض کے لئے۔ کچھ طلب کرنے کے لئے.....یہ بھی کر کے دیکھ لیا..... بار بار اپنی انا کو ممتا پر قربان کر کے، ذلت آمیز رویہ اس اُمید پر برداشت کر لیا کہ کبھی نفرتوں کے بادل چھٹیں گے اور روشنی نمودار ہوگی۔ تمہاری تعلیم گاہوں کے چکّر کاٹے، تمہاری تیمارداری کی، تمہارے لئے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کیا اور تم نے مندمل زخموں پر نمک پاشی کرنے، نشتر زنی کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا.....کس مٹی کے بنے ہوئے ہو تم۔ ایک باپ بار بار بے عزت ہوتا رہا اس آس میں کہ تم دنیا میں اس کا واحد سہارا ہو..... مگر اب تمہارے رویّے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم نہیں بدل سکتے.....کبھی نہیں بدل سکتے۔ ٹھیک ہے جہاں رہو، خوش رہو مگر ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو.....''

یہ کہہ کر ضیار خان نے موبائل بند کر دیا۔ ان کے رخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

.....اور پھر کئی ماہ بیت گئے ایک روز جب ضیار خاں کی ملاقات اپنے دیرینہ دوست ساگر بھارتی سے ہوئی تو انھوں نے یہ ساری روداد بیان کرتے ہوئے کہا۔

''ساگر بھائی! مجھے رہ رہ کر اُن خاتون کی بات یاد آتی ہے جنھوں نے میرے عقدِ اوّل پر کہا تھا کہ ماں کو ستایا ہے اُس کا دل دُکھایا ہے وہ وقت بھی آئے گا جب اس کا بیٹا اسے

ستائے گا.....انہوں نے سچ ہی کہا تھا۔ میری ماں مجھ سے بہت ناراض رہی تھیں کہ ایک معمر عورت اور تین بچّوں کی ماں سے ان کی نوعمر اولاد نے نکاح کر کے اُن کے ارمانوں کا خون کیا ہے۔"

اور ان کے دوست نے سمجھایا۔"دنیاوی اعتبار سے آپ جو بھی سوچیں لیکن اُس وقت آپ نے تو سنت کی پیروی کی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے جب رسولِ اکرمؐ کو شادی کا پیغام بھجوایا تو وہ بیوہ تھیں۔اور بچے بھی تھے۔ جو کام شرعاً جائز تھا اس کے بارے میں یہ سوچنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے"۔....انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے سمجھایا"ضیار صاحب! آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیوی کی صورت میں بہترین نعم البدل عطا فرمایا۔ بھابھی ماہ پارہ آپ کے لئے اللہ کا انعام ہیں۔شکل وصورت کے اعتبار سے بھی، مزاج واطوار کے اعتبار سے بھی اور دینی واخلاقی اعتبار سے بھی ایک اچھی بیوی ہیں.....غم کے موقع پر تسلی دینا، مایوسی میں دلجوئی کرنا، مسائل کے حل کے لئے مفید مشورے دینا، آپ کی خدمت کرنا اور فرمانبرداری کرنا بھی تو ایک اچھی بیوی کی صفات ہوتی ہیں۔

"ساگر بھائی! آپ سے بات کر کے نہ جانے کیوں تشفی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شوکیہ بہت اچھی بیوی ہیں۔"

"یہ شوکیہ کیا ہے؟ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ یہ بات میں نہیں جان سکا۔ جس کا اتنا پیارا نام ماہ پارہ ہو اُسے آپ شوکیہ کیوں کہتے ہیں؟"

"بس کہتے ہیں..... پیار میں۔ وجہ کچھ بھی نہیں ہے" پھر ہنستے ہوئے ضیار خان نے کہا"اب نہیں کہیں گے۔"

"اور ہاں! آپ نے ارمان سے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ بھی مناسب نہیں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی باتیں اگر چہ سو فیصدی درست ہیں لیکن انھیں غصے سے نہیں پیار سے کرنا چاہئے تھا..... دیکھئے میری بات یاد رکھئے گا.....ایک دن وہ بھی آئے گا جب

اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوگا اور وہ آپ کی شفقت و سر پرستی حاصل کرنے کے لئے بے چین ہوگا۔"

ضیار خان نے ساگر صاحب کی نصیحت کو خاموشی کے ساتھ سنا لیکن اس کے رد میں کچھ نہ کہا حالانکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ میں بھی انسان ہوں۔ ایک اولاد کا رویہ جب مستقل خود غرضانہ اور گستاخانہ ہوتو پھر کیسے نہ ڈانٹا جائے۔

.....اور جب چندروز بعد پھر موبائل پر ارمان نے رجوع کیا تو انھوں نے فون کاٹ کر خود ڈائل کیا اور اس سے مخاطب ہوئے۔"ارمان! میں نے گذشتہ دنوں تم سے جو باتیں کیں ان پر مجھے افسوس ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں نے جو باتیں کہیں وہ غلط تھیں بلکہ میرا اندازِ گفتگو مناسب نہیں تھا.....مگر بیٹے! کبھی تم نے سوچا کہ تمہارا سلوک میرے ساتھ کیسا ہے؟ میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہیں انہوں نے تمہیں آلۂ کار بنایا ہے..... وہ تمہارے ہمدرد ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تم مسائل کو اپنے ذہن سے سوچنے کی صلاحیت پیدا کرو۔"

"مگر آپ یہ بھی تو سوچئے کہ میرے ساتھ آپ نے کیا کیا؟ باپ کے ہوتے ہوئے میں کسی یتیم کی طرح پالا گیا۔"

"مگر اس کا ذمّے دار کون ہے..... یہ حالات کس نے پیدا کئے؟ کیا یہ بھی تمہیں معلوم ہے؟ تم میرے بھی ایسے ہی بیٹے تھے جیسے کہ اپنی ماں کے.....ہمارے اختلافات کا تم سے کیا تعلق تھا.....مگر تمہیں استعمال کیا گیا اور دانستہ باپ کی شفقتوں سے محروم رکھا گیا.....یہ قصور کس کا ہے؟" پھر قدرے توقف کے بعد وہ بولے۔

"وہ عورت جس کی وجہ سے تم میرے گھر نہیں آنا چاہتے وہ تمہارے باپ کی ایسی ہی بیوی ہے جیسی کہ تمہاری ماں ہیں..... ہاں ایک نے بے وفائی کی تمام حدیں پھلانگ دیں تو دوسری نے وفاداری اور دلجوئی کی انتہا کر دی.....تم اُس سے نفرت کرتے ہو مگر وہ تمہاری ہمدرد ہے۔ تم یقین تو کیا کرو گے سوچ بھی نہیں سکتے کہ جس کے لئے تم نے نفرتوں کی مضبوط دیوار اپنے دل میں کھڑی کر رکھی ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اولاد کی طرح چاہتی ہے۔ میرے

ذہن کو تمہارے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔اس کے اندرون میں اس قدر جذبۂ ترحم اور رشتوں کی اہمیت کہاں سے آگئی ہے .....اگر ایسا ہوتا تو جو تحائف میں وقتاً فوقتاً تمہارے لئے لے جاتا رہا ہوں وہ تم تک نہ پہنچ پاتے۔ یہ سب اُسی کی محبتوں کا نتیجہ تھے۔وہ عورت اگر تمہاری ماںتا اپنے دل میں نہ رکھتی تو تم جیسے نفرت کرنے والے کو اس شہر میں دورانِ قیام طعام کی سہولت بہم نہ پہنچاتی.....اور دُور کیوں جاتے ہو۔تم نے حال میں ہی شادی کی ہے تمہاری دُلہن کا جوڑا اُس نے کس جذبے سے تیار کرایا؟اس کے لئے سفر کی صعوبتیں اُٹھائیں اور پھر اُسے لے کر تمہارے شہر تک بھی پہنچی..... اور تم.....تم نے اسے مدعو تک نہیں کیا۔کم از کم اپنی اس خوشی میں غیروں کی طرح ہی اُسے شامل کر لیتے.....مگر کتنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا اُس نے کہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی.....تم اتنے نادان تو نہیں تھے بیٹے! کہ کسی کے مخلصانہ جذبوں کو محسوس نہ کرسکو.....کیا مقابلہ ہے اس عورت اور تمہاری ماں کے درمیان۔'' ضیار خان نے سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے پوچھا.....

''سن رہے ہو نا میری بات!''

''جی۔'' ایک نحیف سی آواز آئی۔''آپ موبائل پر بول رہے ہیں۔آپ کا بل بہت آجائے گا۔''

''تم اس کی پرواہ مت کرو۔مجھے اپنے دل کی بات کہہ لینے دو۔تم نے مجھ سے پھر وہی سوال کیا ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں کیا سوچا ہے.....تو سُن لو! میری تمہارے علاوہ اور کوئی اولاد نہیں ہے۔اس لئے میرا جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے..... یہاں تک کہ اگر تمہیں ضرورت پڑے تو میرے جسم میں جو خون ہے اس کا ایک ایک قطرہ بھی تمہارا ہے.....مگر یہ سب کچھ تمہیں اُسی وقت حاصل ہوگا جب تم اپنے عمل سے یہ ثابت کردو گے کہ تم واقعی میری اولاد ہو.....اور میں اُس دن کا انتظار کروں گا.....اُس روشن صبح کا انتظار کروں گا.....خدا حافظ.....''

اور ضیار خان نے موبائل آف کردیا۔ ❁ ❁

خون کا رشتہ

علی گڑھ میں دہلی کانپور ہائی وے پر شاہ نرسنگ ہوم میں میں نے اپنی والدہ کو داخل کیا تھا۔ ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کا آپریشن ہونا تھا۔ یہ نرسنگ ہوم چونکہ بااخلاق ڈاکٹر اور اسٹاف کیوجہ سے معروف ہے اس لیے باہر کے بعض مریض علی گڑھ آ کر ماہر ڈاکٹرس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے یہاں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ نرسنگ ہوم بالخصوص آرتھوپیڈکس مریضوں کے لیے ہے اس لیے وقفہ وقفہ سے مریض آتے رہتے ہیں۔

ایک دن ایک مریض تانگے میں پڑ کر آیا۔ وہ کسی قریبی دیہات کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ کئی مرد اور عورتیں بھی آئی تھیں۔ ایکسرے سے معلوم ہوا کہ اس کی ایک ٹانگ دو جگہ سے فریکچر ہوگئی ہے اور سر میں چوٹ آجانے کی وجہ سے جسم کا کافی خون بہہ گیا ہے۔ کیس ایکسیڈنٹ کا تھا۔ سر اور ناک سے بہنے والے خون نے زخمی کے کپڑوں کو تر بتر کر دیا تھا بظاہر وہ خطرے سے باہر نہیں لگتا تھا۔ لیکن ایکسریز کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض خطرے سے باہر ہے۔ اس کی بیوی ایک کونے میں کھڑی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ دونوں بچے اس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے تھے۔

ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ایک تانگہ میں بہت سے مرد اور عورتیں آگئیں۔ ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے نرسنگ ہوم کے گیٹ سے ہی دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا اور جنرل وارڈ میں زخمی کو دیکھ کر تو وہ طوفانِ بے تمیزی برپا ہوا کہ نرسنگ ہوم میں داخل سارے مریض گھبرا گئے۔ تیمار دار کمروں سے نکل آئے۔ وہ بین کر رہی تھیں جس طرح عموماً دیہاتی

عورتیں کرتی تھیں۔ ڈاکٹر، نرسیں اور اسٹاف کے دوسرے لوگ انہیں ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے مگر کسی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میری والدہ کا آپریشن ہوئے ایک دن ہی ہوا تھا۔ وہ بلڈ پریشر اور گھبراہٹ کی مریضہ ہیں۔ انہوں نے بھی کافی اثر قبول کیا۔ میں نے بھی سمجھایا۔ مگر ساری عورتیں ایک دوسرے سے گلے لپٹ کر رو رہی تھیں اور ایک خاص لہجے میں بین کر رہی تھیں۔

ان میں ایک عورت قابو سے باہر تھی۔ کبھی سینہ کوبی کرتی اور کبھی کسی سے لپٹ جاتی۔ یہ زخمی مریض کی بہن تھی۔ اکلوتی اور شادی شدہ بہن۔ تقریباً ایک گھنٹے تک کہرام بپا رہنے کے بعد خاموشی ہوئی۔ ساری عورتوں کو وارڈ سے باہر کر دیا تھا۔ اور وہ باتوں میں مشغول ہو گئی تھیں۔

بہن اور بھائی کا رشتہ ہی اتنا پاکیزہ اور ماما کا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا۔ میری بھی ایک ہی بہن ہیں اور مجھ سے کس قدر محبت کرتی ہیں۔ میرے ہر غم کو مجھ سے چھین لینے کے لیے تیار..... میری ہر اذیت کو خود سہنے کے لیے بیقرار۔

نرسنگ ہوم کے عقب میں صحن ہے۔ دوپہر کے ڈھائی بجے ہوں گے۔ میں ادھر گیا۔ مریض کی بہن اور ایک مرد جو غالباً اس کا شوہر تھا، ایک قلفی سامنے رکھے کھانا کھا رہے تھے۔ موٹی موٹی روٹیوں کے درمیاں آلو کی سبزی تھی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی دھوپ چونکہ صحن کے کچھ حصے میں آجاتی ہے اس لیے میں ڈاکٹر کے کلینک میں سے ایک کرسی لیکر وہاں بیٹھا 'اردو ڈائجسٹ لاہور' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کھانے کے دوران میاں بیوی دونوں محوِ گفتگو بھی تھے۔

''فکر بھوت جوردار گی ہے۔''

''اور کیا تو ایسی ویسی سمجھ رہی تھی''

''بھیا بچ جائے گا۔ کمپوڈر بول رہا تھا:: عورت بولی۔

''بچ جانے دو۔ ہمر کیا نکساں ہے؟''

''میں تیھے نکساں کی بات نہ کر رئی۔ میں تو کمپوڈر کی بات کر رئی۔''

''ابھی کا کھبر، کھون تو کھوپ بے ریا۔'' شوہر مسکراتے ہوئے بولا'' ہے ری! ترے کون لگ گیئے۔''

''کوسن ووسن سے کیا۔ بوتو بھابھی نے بھی کم نہ دیئے۔ پر یہ تو اس کے کیے کا پھل ہے۔ کسی کے حصے کی جمین پر کچھ کرنا کوئی آسان نہیں ہووے ہے بھگوان بھی تو دیکھے ہے کہ جاستی کس کی ہے۔ جے اُسی کا بلدہ ہے۔''

میں ان کی گفتگو سن کر حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ وہی بہن ہے جو ابھی کچھ دیر قبل نرسنگ ہوم سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ اور اپنے بھائی کو لپٹی ہوئی تھی اور کسی بھی طرح خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یہ وہی ہے جو ابھی ماتا ومحبت کی دیوی لگ رہی تھی۔ زمین کے تنازعہ کی وجہ سے مخالف ہے کہ اسے قدرت کی طرف سے انتقام تصور کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کر رہی ہے۔ تو پھر کچھ دیر قبل جو کچھ ڈرامہ تھا ایکٹنگ تھی، دنیاداری تھی سوچ کی لہریں مجھے کہیں سے کہیں لے جاتیں۔ دنیاداری میں معمولی فائدوں اور آسائشوں کے لیے ہم نے رشتوں، ماتا کے رشتوں کو کتنا کمزور کرلیا ہے چندروزہ زندگی کے لیے۔ اور پھر سب چھوڑ جائیں گے اپنے ورثا کے لیے تاکہ وہ عیش کریں ہم اپنے ساتھ کیا لے جائیں گے؟ وہ اعمال جو آخرت میں سراسر ہمارے لیے خسارے کا باعث ہوں گے۔ حقدار وہاں دامنگیر ہوں ہمارے اچھے اعمال ان کے حصے میں آئیں ان کے بُرے اعمال ہمارے حصے میں آئیں ''جہاں ہمیں اچھے اعمال کی ضرورت ہوگی۔ جس سکے کا چلن وہاں ہوگا ہم اس سے محروم ہوں گے۔ مجھے جھرجھری سی آگئی بالخصوص مریض کی بہن سے نفرت سی ہونے لگی بے اختیار مولانا ابوسلیم محمد عبدالحیؒ کی ایک بات میرے ذہن کے اسکرین پر آگئی۔

''کیسا بیوقوف ہے وہ شخص جو اپنے مال کو چھوڑ کر دوسروں کے مال سے محبت کرتا ہے۔ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے آگے بھیج دیا اور جو اس ہمیشہ رہنے والی زندگی میں تمہارے کام آئے گا۔ رہا وہ مال، جو اس دنیا میں تمہارے پاس ہے وہ تو تمہارے وارثوں کا مال ہے اب سوچو تمہیں کس مال سے محبت ہے۔ اپنے مال سے یا پرائے مال سے۔'' کھانے سے فارغ ہو کر

ہاتھ منہ اور قلفی ہینڈ پمپ پر دھو کر وہ دونوں پھر وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ مرد نے بیڑی سلگائی اور کش لیتے ہوئے کہا۔ ہم تو کہیں سُسر مر جائے تو پاپ کٹے:

''کیا بولا! اس کی بیوی ایک دم بھڑک کر بولی۔'' تو نہ مر جائے۔ اب نہ بولیو جے بات۔''

''ارے ابھی تو تو کھود کے رئی۔''

''میں جے کاں کے رئی۔ میں نے تو جے کئی کہ جے جاتی کا بلدہ ہے:

''تیرا تو بو دُشمن ہی ہے۔''

''ہونے دو..... میں تو نا ہوں۔ میرا ایک ہی تو بھیا ہے۔ بو جیسا بھی ہے ہے تو بھیا۔''

مرد نے فوراً اپنا لہجہ بدل کر مسکراتے ہوئے کہا'' ارے ہمر کا پھائدہ۔ ہم سے رام رام بھی کر لے ہے دُشمن تو بو تیرا ہے۔''

''ہونے دو ہے تو۔ میں کھود جو کہوں پر تجھ سے تھوڑی ہی کہلبا لوں گی۔'' پھر قدرے توقف کے بعد بولی'' بو مجھ سے بات نہیں کرتا نہ کرے۔ پر میں اُسے دیکھ کر ہی دل ٹھنڈا کر لے ہوں۔ بو ہے تو میرا بھیا ہی۔''

اور میں ان دونوں کی گفتگو کے مدر جزر میں پھر ہچکو لے کھانے لگا۔ میں خون کے ان رشتوں اور معاشرتی مسئلوں کا پھر سے تجزیہ کرنے لگا۔ اب وہ عورت مجھے باوقار اور ہمدر لگ رہی تھی۔

طویل خاموشی کے بعد عورت نے پھر کہا۔ سُن! میں بھیا کے ساتھ اپنے گھر جاؤں گی۔ بو مجھے نکال نا دے گا۔ میں اس کی کھدمت کروں گی جب بو ٹھیک ہوگا تو کوئی آؤں گی۔ تو کلفی لے کے جا۔ اور پھر وہ دعا مانگنے لگی۔

''ہے بھگوان! میرے بھیا کو ٹھیک کر دے۔ چاہے مجھے کچھ ہو جائے پر بو ٹھیک ہو جائے۔ ہے بھگوان میرے بھیا کے ننھے منے بالکوں کی اور دیکھ لے۔''

میں نے دیکھا وہ پھر رو رہی تھی۔'' ✪ ✪

سانپ

''آج کل آپ پریشان لگتے ہیں۔''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''مگر چہرے سے تو ایسا ہی لگتا ہے.....کچھ چُپ چُپ سے۔سوچوں میں گم۔''

''یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔افسانہ نگار ہوں۔سوچنا میری فطرت ہے۔کیا تم نہیں سوچتے؟''

''سوچتا ہوں مگر اس طرح نہیں جس طرح آج کل آپ.....''

''تو پھر تم کبھی کامیاب افسانہ نگار نہیں بن سکتے۔'' اس نے بات کاٹ کر کہا ''ایک افسانہ نگار کو خیال سے اظہار تک سوچ کی صلیب پر لٹکے رہنا پڑتا ہے۔سماج کے کسی فرد کا معمولی کرب افسانہ نگار کے لیے بڑا غیر معمولی ہوتا ہے۔وہ سوچتا ہے۔ہر ہر پہلو سے سوچتا ہے اور.....اچھا یہ بتاؤ کہ چائے لوگے یا ٹھنڈا؟''

''کچھ بھی چل جائے گا۔''

''احمد میاں کو بلاؤ۔''

''پانچ بج رہے ہیں۔کیا آپ گھر نہیں چل رہے ہیں؟''

''سب لوگ چلے گئے؟''

''جی ہاں۔''

''کمرے لاک کرا دیئے؟''

''جی ہاں۔''

''ہاں میں بتا رہا ہوں کہ افسانہ نگار سماج کا بے حد حساس فرد ہوتا ہے۔ کوئی بھی تجربہ خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی اُس پر وہ پوری نظر رکھتا ہے۔ وہ واقعات اور تجربات کو ہر پہلو سے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد اپنے احساسات کی تشکیل کر کے افسانوی ہیئت میں پیش کر دیتا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''یہ تو سب کچھ صحیح ہے مگر.....''

''نہیں، نہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرا خیال ہے مجھے اپنی بات کی صداقت ثابت کرنے کے لیے تمہیں وہ نامکمل افسانہ سنانا ہوگا جس کے فطری اور منطقی اختتام کے لیے میں شدید ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔'' اُس نے اپنے دوست کا چہرہ پڑھتے ہوئے کہا جسے غیر محسوس ڈھنگ سے وہ اپنے مقصد کی سمت لے آیا تھا۔

اُس نے میز پر رکھی ڈائری اٹھائی اور افسانہ سنانے لگا۔

وہ ایک سانپ تھا جو ٹوٹے ہوئے مکان کی دیوار کے پاس پڑا تھا۔ سکڑا سمٹا، بے جان سا، گری ہوئی دیوار کے ٹیلے پر کھڑے بہت سے بچے اور بڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پتھر تھا تو کوئی لکڑی لے کر بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک معمر شخص سمجھا رہا تھا کہ اُسے کس طرح مارا جائے۔ سانپ کے جسم کو ذرا سی حرکت ہوتی اور تماشائی کئی گز پیچھے ہٹ جاتے۔

''یہ بہت خطرناک سانپ ہے۔ اس کا کاٹا بچ نہیں سکتا۔ ایک شخص نے کہا۔

''بہت زہریلا سانپ ہے یہ۔'' دوسرے نے کہا۔

''ارے یہ کالی گنڈار ہے۔'' کئی لوگوں نے حیرت سے اُس شخص کی طرف دیکھا جو وضع سے دیہاتی لگتا تھا۔'' اسے مارلو۔ اس پر اگر کالا گنا بوجایا جائے تو دِق کے مریضوں کو پھائدہ کرتا ہے۔''

''اس نے کسی کو کاٹ بھی لیا ہے، دیکھو اس کی دم جھڑ گئی ہے۔'' ایک اور شخص نے حیرت انگیز جانکاری دی۔

''ابھی تین چار دن پہلے ہی تو اکرام اللہ خاں کے لڑکے کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے۔ یہی ہو۔''

غرض سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے کہ سانپ نے دھیرے دھیرے رینگنا شروع کردیا۔

''مارو اسے ورنہ کسی سوراخ میں گھس جائے گا۔'' اور کئی نوجوان لکڑیاں لے آگے بڑھے۔

''اسے مت مارو، یہ تو سردی سے آپ ہی مر رہا ہے۔'' تماشائیوں میں سے ایک آواز آئی۔

سب نے اُس شخص کو حیرت سے دیکھا۔ ''تم سب لوگ قیاس آرائیاں کررہے ہو۔ ضروری نہیں ہے یہ زہریلا ہو۔ سارے سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔''

''تو پھر لے جاؤ اسے۔'' ایک شخص نے تلخی سے کہا۔ ''ہمیں اس سے خطرہ ہے۔''

اور اس شخص نے نہایت اعتماد سے سانپ کو اُٹھالیا۔ اُسے آستین میں رکھا اور چل دیا۔

مجمع میں پھر قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں۔ کسی نے کہا۔ ''وہ کوئی سپیرا تھا۔ ورنہ اتنی بے فکری سے کیسے پکڑ لیتا۔''

دوسرے نے اس خیال کی تردید کی۔ ''سپیرا تو نہیں لگتا۔ سانپ پکڑنے کا عمل جانتا ہوگا۔''

''وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اسی لیے تو بتا رہا تھا کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔ اُسے زہریلے سانپوں کی شناخت ہوگی۔'' تیسرے نے کہا۔

اور پھر بھیڑ میں موجود لوگ اِدھر اُدھر رینگنے لگے۔

اُس کے جسم کی حرارت پا کر سانپ میں جان آگئی تھی اور اس نے اپنی گرفت مضبوط کرنی شروع کردی تھی۔

یہ بہت خطرناک سانپ ہے۔ یہ زہریلا سانپ ہے۔ یہ کالی گنڈار ہے۔ اکرم اللہ خان

کے لڑکے کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوئی ہے۔ وہ آوازوں کی بازگشت اپنے ذہن میں محسوس کرر ہا تھا۔

یہ سارے لوگ بیوقوف نہیں ہو سکتے۔ اور پھر سانپ سانپ ہوتا ہے۔ مجھے.....نہیں میں اسے پالوں گا۔ سانپ کسی کو بے وجہ نہیں کاٹتا۔ ہر سانپ زہریلا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ بڑے اعتماد کے ساتھ اس نے فیصلہ کیا تھا۔

وہ سانپ کو اپنے ساتھ رکھتا۔ اس کا بوجھ برداشت کیے رہتا۔ اس کے دوستوں کو اس کے اس فعل پر بڑا تعجب تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ سانپ کہیں انہیں نہ کاٹ لے۔ سانپ سے دوستی کو عقل مندی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

سانپ واقعی بے ضرر تھا۔ کبھی کبھی وہ آستین سے باہر آ جاتا۔ آس پاس ٹہلتا اور واپس آستین میں پہنچ جاتا۔

اور پھر ایک دن سانپ اس کے دل میں اُتر گیا۔

وہ بھی سانپ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ سانپ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور فربہ ہو گیا تھا۔ نئی قیام گاہ سانپ کے لیے زیادہ پرسکون تھی لیکن اب وہ باہر کے حالات سے بے خبر رہتا اور پھر رفتہ رفتہ وہ یہ بھول گیا کہ وہ کہاں ہے؟ کبھی وہ اپنی لپلپاتی زبان سے اس کے دل کو چاٹنے لگتا تو وہ بڑا کرب محسوس کرتا۔ معمولی سی ٹھیس لگ جاتی تو سانپ احتجاج کرتا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ پھر وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا۔ وہ اپنا کرب کسی پر ظاہر بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے فیصلے کے آگے کسی کی بات نہیں مانی تھی۔

اُسے ایک بزرگ کی نصیحت یاد آتی۔ بیٹے! سانپ زہریلا ہو یا نہ ہو، دوستی کے قابل ہرگز نہیں ہوتا۔ سانپ کی فطرت ہی ڈسنا ہے۔''

کبھی آوازوں کی وہی بازگشت سنائی دیتی۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ یہ بہت زہریلا ہے۔ اس نے کسی کو کاٹ لیا ہے۔ اکرام اللہ خان کے لڑکے کی موت سانپ کے کاٹنے سے ہوئی ہے۔

وہ عجیب اذیت میں مبتلا تھا۔ ہر وقت سوچتا رہتا۔ اسے مار ڈالنا چاہیئے۔

نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

اسے نکال دینا ہی بہتر ہے۔

لوگ کیا کہیں گے؟

لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان کو ارادہ واختیاری کی پوری آزادی ہے۔

یہ بے آسرا ہو جائے گا۔

مجھے کیا؟

نہیں، تم اتنے بے حس ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اپنے ضمیر سے جنگ کرتے رہنا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ لیکن ہر بار وہ شکست کھا جاتا۔ اس کی سوچوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا جسم پیلا پڑنے لگا تھا۔ شاید اس کے جسم میں زہر سرایت کرنے لگا تھا۔

''یہ کہانی ہے جس کے اختتام کے لیے میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں۔'' اُس نے ڈائری میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ہی.....'' وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ اس کے دوست کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔ رندھی ہوائی آواز میں اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر شدت جذبات سے آواز نے اندر ہی دم توڑ دیا۔

پھر وہ اٹھا اور بوجھل قدموں سے دروازے کی سمت رینگ گیا۔

چائے پیالیوں میں ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

۞ ۞ ۞

امن کا پیامبر

میڈیکل کالج کے اس وارڈ میں ایڈمٹ ہوئے اسے بیس دن بیت چکے تھے۔ اس دوران میں اسے اپنے بارے میں ایک ایک بات کی جانکاری ہوگئی تھی۔ گوکہ اس کے عزیزوں نے اُسے تاریکی میں رکھنے کی خاصی کوشش کرلی تھی مگر اس نے اپنی عمر کے ساٹھ سال یونہی تو نہیں گزارے تھے..... اور اب جب کہ خون کی مختلف جانچوں اور بائپسی کے بعد دو بار ریڈیو تھراپی بھی ہوچکی تھی۔ پھر وہ جس مخصوص وارڈ میں ایڈمٹ تھا وہاں مریض سارے ایک ہی مرض سے متعلق تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ کسی نے اس کے چہرے پر کبھی فکر اور تشویش کے بادل نہیں پائے۔ اس کی بیٹیاں آتیں، مزاج پرسی کرتیں، وہ انہیں تسلی دیتا زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھاتا۔ دنیا کی زندگی کو آخرت کے لئے مہلتِ عمل بتاتا۔ سماجی رشتوں کے حقوق و فرائض سمجھاتا۔ بیٹیاں باپ کی باتیں صبر و تحمل کے ساتھ سُنتیں لیکن لاکھ کوشش کے باوجود آنسوؤں کے ستارے پلکوں پر جھلملانے سے نہ روک پاتیں۔ وہ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں تسلی دے کر رُخصت کر دیتا۔ وہ بہت باہمت شخص تھا۔ زندگی کو اللہ کی امانت سمجھ کر صبر و رضا کا پیکر بن کر رہنا ہر کسی کے بس کی بات کہاں ہوتی ہے..... مگر آج وہ خلافِ معمول گُم صم اور اُداس تھا۔ فکر اس کے چہرے سے مترشح تھی۔

حسبِ معمول وہ آج بھی پانچ بجے بیدار ہوگیا تھا۔ رہ رہ کر اُٹھنے والے درد کی ٹیسوں

سے نیند تو کیا آتی ہو گی لیکن قدرت نے اسے قوت برداشت بھی اتنی دے رکھی تھی کہ چہرے پر اُبھری درد کی لکیریں آواز کا روپ دکھا کر باہر نکل سکتی تھیں.....وہ اُٹھا' آہستہ آہستہ ٹوائلٹ گیا، پھر واپس بیڈ پر آکر پاس رکھے مٹی کے ایک بڑے ڈھیلے سے تیمم کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے کے لئے نیت باندھی ہی تھی کہ اخبار والا اس کے برابر اخبار رکھ گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ روز کی طرح اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔

اخبار بینی اس کے لئے ناگزیر تھی۔ اسپتال آتے وقت بھی اس نے اپنے بیٹے سے یہی وعدہ لیا تھا کہ اسے اخبار کے مطالعہ سے محروم نہیں رکھا جائے گا مگر آج کے اخبار نے اس کے چہرے کو اتنا زرد اور پژمردہ کر دیا تھا کہ اسے اس کے مرض کی تشخیص کے علم اور دوبار کی ریڈیو تھراپی نے بھی نہیں کیا تھا۔ وہ زانوؤں پر اخبار رکھے، ایک ہاتھ کی کلائی ماتھے پر رکھے آنکھیں بند کیے اور تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے نڈھال سا پڑا تھا کہ اس کا بیٹا آ گیا۔

''ابو السلام علیکم۔''

اس نے آنکھیں کھولیں اور صرف ہاتھ اُٹھا کر سلام کا جواب دیا۔

''لیجئے، دودھ پی لیجئے۔''

اس نے پھر ہاتھوں کے اشارے ہی سے منع کیا۔

''کیوں نہیں پئیں گے.....اُٹھیے۔''

بیٹا اس کی کمر کو سہارا دے کر بٹھانے لگا۔ وہ بیٹھ گیا، اور بادلِ ناخواستہ دودھ کا پیالہ بیٹے کے ہاتھ سے لے لیا۔ ایک پیالہ دودھ میں بھیگے ہوئے گلوکوز کے دو تین بسکٹ ہی اس کا ناشتہ تھے اور یہی غذا دوپہر اور رات کا کھانا تھی۔ اس نے دو تین چمچ بمشکل حلق سے اُتارے اور پیالہ بیٹے کی جانب بڑھا دیا۔

''پی لیجئے نا! اگر یہ بھی پیٹ میں نہیں جائے گا تو کمزوری اور بڑھ جائے گی۔''

''بس، جی نہیں چاہ رہا ہے'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ظاہر ہے جب مرض نے حلق سے گزرنے والی غذا کے لئے ہی راستہ تنگ کر دیا تھا تو پھر آواز کیوں نہ متاثر ہوتی۔

''جی نہیں چاہ رہا ہے تو دوا سمجھ کر ہی پی لیجئے۔'' بیٹے نے اصرار کیا اور وہ ایک بار پھر دودھ پینے کی کوشش کرنے لگا۔

بیٹے نے اخبار پر نظر ڈالی تو سارا معاملہ جان گیا وہ باپ کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ کتنی بار خوشامد کی ہے ابو! کہ اخبارات مت پڑھا کیجئے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دیجئے..... ابھی دنیا فنا نہیں ہو رہی ہے..... ملک کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا۔ یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے اور ہوتا ہی رہے گا۔ اپنی جان کو ہلکان کر کے یہ سب روک تو نہیں لیں گے۔ آپ قاضی نہیں ہیں جو شہر کے اندیشے میں دُبلے ہو رہے ہیں۔ میں کل سے اخبار بند کرا دوں گا۔'' بیٹے کے لہجے میں ہمدردی کے ساتھ احتجاج بھی تھا۔

''نہیں یہ م..... م'' اسے پھندا لگ گیا دُودھ منہ اور ناک کے راستے پھوار کی طرح باہر نکل پڑا۔ پیالہ بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا جس سے بیڈ شیٹ خراب ہو گیا۔

وارڈ کے اکثر مریض اور تقریباً سبھی تیمار داران کی جانب متوجہ تھے مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ بیٹے کے مبہم لکچر سے بھی کوئی معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

بیڈ شیٹ بدل کر باپ کو سہارے سے لٹاتے ہوئے بیٹے نے پھر کہنا شروع کیا ''ابو آپ نے ساری عمر جو غم کیا اس سے کیا حاصل ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اب آپ اپنی فکر کیجئے۔ اپنی صحت کی فکر۔ اگر خدانخواستہ آپ نہیں رہے تو ہم بے سہارا ہو جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو کیا.....'' اتنا کہہ کر وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

'' بیٹے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ موت برحق ہے۔ جس وقت اور جس حال میں آنا ہے آ کر رہے گی۔'' کچھ توقف کے بعد اُس نے پھر کہا'' یہ دنیا تو عارضی قیام گاہ ہے۔ اور بیٹے یاد رکھو سب سے بڑا سہارا اللہ ہے۔ مایوس اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لاؤ مجھے اخبار اُٹھا دو۔''

اور اخبارات باپ کے ہاتھ میں دے کر بیٹا بہت دیر تک برابر پڑے ہوئے اسٹول پر اُداس بیٹھا رہا۔

"اب کسی عبادت گاہ کو نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔"

متنازعہ عبادت گاہ کی جانب مارچ کیا جائے گا۔"

"مارچ کرنے والوں کو مزا چکھایا جائے گا۔"

"حکومت نے ٹکراؤ کو روکنے کے لئے سخت انتظامات کئے ہیں۔"

۶ر دسمبر کو یوم سیاہ منایئے۔

"۶ر دسمبر کو یوم فتح منانے کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔"

وہ کبھی اخبار کی ان سرخیوں کو پڑھتا اور کبھی ان کے متن۔ حکومت کے اطمینان بخش بیانات کے باوجود، دونوں فرقوں کے حوالوں سے اشتعال انگیز خبریں پڑھ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چند سال قبل جیسا خونیں کھیل ایک بار پھر کھیلا جائے گا کہ مستقبل قریب میں اس کا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ اسے پنڈت جواہر لعل نہرو کی ۱۹۴۷ء میں ریڈیو سے نشر ہونے والی تقریر کے یہ جملے یاد آئے کہ "ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سب مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہم عملاً اور فعلاً تنگ دلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔"

وہ سوچنے لگا۔ کاش ہم ایسے ہوتے۔ کاش فرقہ وارانہ منافرت کے پودے کو ہی کچل دیا جاتا تو آج یہ تناور درخت نہ بنتا اور اس کی جڑیں دُور دُور تک نہ پھیلتیں۔

"کہیئے کیا حال ہے اب آپ کا؟" اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بیڈ کے پاس سینیر ڈاکٹر جن کے وہ زیرِ علاج تھا کئی جونیر ڈاکٹرس اور نرسیں کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر اس کے حلق کو دیکھا پھر گردن پر اس جگہ انگلی رکھ کر معائنہ کیا جہاں ریڈیو تھراپی کی گئی تھی۔

"اگر آپ نے شروع میں ہی جانچیں کرا کر علاج کرا لیا ہوتا تو آج یہ تکلیفیں نہیں اُٹھانا پڑتیں اس مرض کی جڑیں جسم میں اس طرح پیوست ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ہتھیلی کی جانب موڑ کر ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بتایا۔ مگر آپ کا مرض ابھی دوسری اسٹیج میں ہے۔ اُمید رکھیئے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

''خون خرابہ تو نہیں ہو گا نا!''

''کیا؟ کیسا خون خرابہ؟''

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں، اس نے گھبرا کر کہا اور ہونقوں کی طرح ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے چند لمحے اس کی بدحواسی کو دیکھا پھر اگلے بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔

ڈاکٹر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ مگر وہ بھی کیا کرتا۔ شروع میں کون اتنی توجہ دیتا ہے۔ کس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معمولی سی تکلیف کسی لاعلاج مرض کا آغاز ہے۔ اور پھر موت تو کسی بہانے آنی ہی ہے۔ موت سے کون ڈرتا ہے۔

وارڈ کے آخری مریض کو دیکھ کر لوٹتے ہوئے ڈاکٹر پھر اس کے بیڈ کے پاس رُک گیا۔ غالباً وہ اس کی ذہنی کیفیت کو محسوس کر چکا تھا۔ سرہانے رکھے اخبار کو موڑ کر پیچھے الماری میں پھینکتے ہوئے اس نے کہا ''آپ کے لئے اخبار پڑھنا مفید نہیں ہے۔ اچھا یہ ہے کہ آپ ٹی وی دیکھیں۔ ٹی وی مریضوں کے لئے ہی رکھا گیا ہے۔'' ڈاکٹر نے ٹی وی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مگر ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ پھر ماضی کے اذیت ناک مناظر میں کھو گیا۔ ذہن کی اسکرین پر چند سال پہلے کے مناظر تھے۔ لُٹتی ہوئی دُکانیں، جلتے ہوئے مکانات، نوجوانوں کا سفاکانہ قتلِ عام، بچوں کی آہ و بکا اور خواتین کی آبروریزی۔ اور پھر گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''لیٹے رہئے..... اب کیسی طبیعت ہے۔

''ٹھیک ہے..... تم کب آئیں؟''

''کافی دیر ہو گئی..... آپ کی آنکھ لگ گئی تھی۔''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے بیوی کو قریب بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ اسٹول سرہانے کی جانب سرکا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''جی کیا بات ہے؟''

''۶ر تاریخ آرہی ہے۔ لڑکیوں کو گھر بُلا لینا۔ ہمارا محلہ زیادہ محفوظ ہے۔''

''٦/تاریخ کو کیا ہوگا؟'' بیوی نے لاعلمی سے پوچھا۔

''خون خرابہ ہوگا.....کرفیو لگے گا اور.....''

''ابو بس کرو۔ یہ باتیں سوچنا چھوڑ دو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ٦/تاریخ کو۔ حکومت کچھ نہیں ہونے دے گی۔ اپنی صحت کا خیال کیجئے۔'' بیٹے نے پھر سمجھایا وہ آبدیدہ تھا۔

''تم بچے ہو۔ نہیں سمجھ رہے ہو۔''

''آپ نے سمجھ کر کیا کرلیا۔ ساری زندگی اتحاد کا ورد کرتے گزار دی۔ آپ نے اپنے شہر کو ہمیشہ فرقہ پرستی کی زہریلی ہواؤں سے بچانے کی کوشش کی مگر جب سارے ملک میں طوفان آیا تو آپ کی ساری کوششیں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

''مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ تم بھی حوصلہ شکنی مت کرو۔ جو چراغ میں نے جلایا ہے۔ وہ ٹمٹما تو رہا ہے مگر بجھا نہیں ہے۔ تم نوجوان ہو۔ اس چراغ سے بہت سے چراغ جلا سکتے ہو۔ مجھ سے وعدہ کرو۔'' اس نے بیٹے کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چوم لیا۔

''اپنے آپ پر بھی ترس کھائیے ابو۔ آپ کم بولیے۔ کم سوچئے۔ آپ اسپتال میں ہیں۔ اس وقت اپنی کمزوری اور بیماری سے نجات پانے کے لئے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کیجئے۔ میں آپ کا ہر حکم مانوں گا۔''

''جیتے رہو بیٹے!'' اس نے شفقت بھرا ہاتھ بیٹے کے سر اور گال پر پھیرا۔ اب میں نہیں مروں گا انشاء اللہ.....'' پھر قدرے توقف کے بعد بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ بولا۔ ''دراصل ہمارے مشترکہ سماج کو نفرت کا کینسر ہوگیا ہے۔ آہستہ آہستہ گلی کوچے تک سرایت کرگیا ہے مگر اب بھی یہ لاعلاج نہیں ہے۔ اگر معالج مل جائیں تو سب کچھ ٹھیک ہوسکتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''

بیٹے سے گفتگو کرنے کے بعد اس کے دل کا بوجھ ضرور کچھ کم ہوا تھا'' مگر زیادہ بولنے کی وجہ سے درد کی ایک اذیت ناک لہر گردن سے سر تک چلی۔ اس نے چادر اوڑھ لی تاکہ چہرے پر کرب کے نقوش دیکھ کر بیٹا بے چین نہ ہو۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ کسی نرس نے آ کر ٹی وی آن کر دیا تھا۔ وہ جاگ گیا۔ ٹی وی سے خبریں آ رہی تھیں، ایک خبر فرقہ وارانہ یک جہتی کے تعلق سے تھی۔ تصویر میں چند لوگوں کو دوسرے فرقے کی عبادت گاہ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ابھی انسانیت مری نہیں ہے۔ ابھی نفرت اور فرقہ پرستی کا کینسر آخری اسٹیج میں داخل نہیں ہوا ہے۔ میرا احساس ٹھیک ہی ہے۔ اس نے سوچا اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ اس نے کروٹ لی اور تکیے کے نیچے سے قلم اور کاپی نکال کر کچھ لکھنے لگا۔ بیٹا کسی ضرورت سے جا چکا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ وارڈ کے اکثر مریض سو گئے تھے۔ تکلیف کی شدت سے جنھیں نیند نہیں آ رہی تھی اپنے اپنے کمبلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھے۔ وہ بستر سے اُٹھا۔ سر اور کانوں کو مفلر میں لپیٹا۔ ہاتھ میں چھتری لی تکیے کے نیچے سے کاپی نکال کر کئی صفحات پھاڑے اور ان کا رول بنا کر آہستہ آہستہ اسپتال سے باہر آ گیا۔ کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ وہ اپنی اپیل کل کے ہی اخبار میں چھپوانا چاہتا تھا۔ پرسوں تو ۶ ر تاریخ ہی تھی۔ وہ پیدل ہی چل دیا۔ اسپتال شہر سے دو کلو میٹر دُور تھا۔

ایک کلو میٹر چل کر اس کی سانس پھول گئی۔ سر چکرانے لگا۔ ہوا لگنے سے درد کی لہر نے بے چین کر دیا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ دُور دُور تک تاریکی کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔

صبح لوگوں نے ایک لاش دیکھی۔ سڑک کے کنارے، کسی ٹرک یا بس سے کچلی ہوئی۔ پھر بھیڑ بڑھتی گئی۔ لاش کے ہاتھوں میں رول کیا ہوا وہ کاغذ ابھی تک جوں کا توں موجود تھا۔ جس میں فرقہ وارانہ یک جہتی قائم رکھنے کی اپیل کی گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

نعم البدل

''آج صبح سے میرا دل گھبرا رہا ہے۔کہیں چلئے نا'' میری بیوی نے مجھ سے اصرار کیا۔

''کہاں چلیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کھانے سے نمٹ لیں ورنہ بچے یونہی سو جائیں گے۔'' میری بیوی نے کہا'' پھر بھائی جان کے یہاں چلیں گے۔''

میں جیسے سکتہ میں رہ گیا۔

''چپ کیوں ہو گئے۔''

میں نے مصنوعی مسکراہٹ سے کہا'' نہیں میں چپ کہاں ہوں؟ پھر قدرے توقف کے بعد کہا'' پارک چلتے ہیں۔''

''بھائی جان کے یہاں کیوں نہیں'' انہوں نے تشویش ناک انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو ویسے ہی کہا تھا۔ وہیں چلیں گے۔'' میں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن میری آنکھوں کے سامنے پندرہ دن پہلے کا سارا منظر ایک بار پھر آ گیا۔

ہوا یہ تھا کہ میں جب بھائی جان کے یہاں گیا تو باتوں باتوں میں بچوں کا ذکر ہونے لگا۔ بھابھی جان نے اپنے پانچ سالہ بیٹے کا قصہ ہنستے ہوئے سنایا۔انہوں نے کہا پرسوں اس کی دادی نے جب پیار کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم اپنے بیٹے کا بیاہ کریں گے تو وہ جھٹ بولا

دادی ابھی تو کسی سے میرا لو (LOVE) بھی نہیں ہوا ہے۔ پھر میرا بیاہ کیسے ہوگا؟ اور یہ کہہ کر انہوں نے قہقہہ لگایا۔ بھائی جان بھی ہنسنے لگے۔ میں بھی مسکرانے لگا۔ مگر میری مسکراہٹ طنزیہ تھی جسے دونوں نے محسوس کیا۔ میں نے کہا یہ سب ٹی۔ وی کا کرشمہ ہے۔ ان معصوموں کو جب ہر وقت عشق و محبت کی تعلیم مل رہی ہے تو پھر یہی سب کچھ ظہور میں آئے گا۔ بھائی جان میری بات پر سنجیدہ ہو گئے اور بیوی کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے جو اُن کی دن بھر غیر موجودگی میں بچّوں کو ہر وقت ٹی وی دیکھنے کا موقع دیتی ہیں۔ بھابھی جان نے جواباً انہیں قصور وار قرار دیا۔ اور پھر بات اتنی بڑھی کے غصّے میں بھابھی جان نے اپنا جوتا ٹی وی کے اسکرین پر اتنی زور سے مارا کہ وہ چکنا چور ہو گیا۔ تین چار ہزار روپے کا بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی برباد ہو گیا۔ اگر چہ دونوں میں کسی نے میرے ساتھ نازیبا رویہ اختیار نہیں کیا۔ میرے سمجھانے بجھانے پر دونوں خاموش بھی ہو گئے لیکن میں یہ مجرمانہ احساس لیے ضرور رخصت ہوا کہ اس سارے واقعہ کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ میرے کانوں میں بھائی جان کے یہ الفاظ کئی دن تک گونجتے رہے کہ اب اس گھر میں ٹی وی کبھی نہیں آئے گا۔

میری بیوی نے برقع پہنتے ہوئے کہا "چلئے"۔ میں تیار ہو گئی۔

میں اُٹھ گیا اسکوٹر باہر نکالا مگر یہی سوچتا رہا کہ جس گھر کو میں نے ٹی وی سے محروم کر دیا ہے۔ تین چار ہزار روپے کا نقصان کر دیا ہے وہاں پہلے جیسے تعلق کا اظہار کیونکر ہو سکے گا۔

چند منٹ کے بعد ہی ہم بھائی جان کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازہ کھولتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ہمارا استقبال کیا۔ دلان میں پہنچ کر میری نظر سب سے پہلے اس ریک کی جانب گئی جہاں ٹی وی رکھا ہوتا تھا۔

"ارے!" میرے منھ سے اچانک نکلا۔ جسے صرف میں ہی سن سکتا تھا۔ بلیک اینڈ وہائٹ کی جگہ نیا کلر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔

❁ ❁ ❁

گُڑیا

وہ بہت خوبصورت گڑیا تھی۔

پرنٹڈ گلابی جمپر اور غرارہ پہنے کرن لگا دوپٹہ گلے میں ڈالے اور ہاتھ میں پرس لٹکائے۔ بالکل سچ مچ کی لڑکی لگ رہی تھی وہ۔

''ابو وہ.....وہ گڑیا خرید لیجئے.....بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

نئے مکان کے ڈیکوریشن کے لیے وہ بہت سا سامان خرید رہے تھے۔ بیڈ کور، ٹیبل کور، گلدستے، شوپیس اور بہت سے کھلونے۔ ''آپ نے کوئی گڑیا تو خریدی بھی نہیں ہے۔'' دکان دار نے گڑیا کاؤنٹر پر رکھ دی۔

''ہاں ابو اسے خرید لیجئے۔ دیکھئے کتنی اچھی ہے اس میں اپنے کمرے کے شوکیس میں رکھوں گا۔'' وہ چہک کر بولا۔

ابو نے گڑیا کو دیکھا۔ کچھ سوچا اور بولے۔ ''نہیں ہم نہیں خریدیں گے۔ یہ اچھی نہیں ہے۔'' ابو اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ وہ حیرت سے ان کا منہ تکتا ہوا گھسٹنے لگا۔

''یہ بہت معمولی گڑیا ہے بیٹے۔ ہم کسی بڑی دکان سے خریدیں گے۔ ہم ایسی گڑیا کیوں نہ لیں جو ہمارے شایان شان ہو۔''

''لیکن.....''

''اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ابو نے اس کی بات کاٹ کر سمجھایا۔ ''تمہیں یہ اچھے کپڑے خوبصورت لگ رہے ہیں ان کی کوالٹی اچھی نہیں ہے۔ اسٹینڈرڈ کا مال بڑی دکانوں پر ملتا ہے۔

تم ابھی بچے ہو تم کیا جانو۔اب وہ ایک بڑی سے دوکان کے سامنے تھے۔

''مگر ہمیں تو وہی اچھی لگ رہی ہے۔'' اس نے پھر اپنی پسند پر اصرار کیا۔

''تم بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔ خواہ مخواہ ضد کرتے ہو۔'' ابو جھنجھلا گئے۔ ''جو ہم اچھی سمجھیں گے وہی خرید کر دیں گے۔اپنے معیار سے کمتر چیز خرید کر ہم بے عزت ہونا نہیں چاہتے۔''

اور وہ اداس ہو گیا۔

اُس کے کمرے کے شوکیس میں ایک قیمتی اور خوبصورت گڑیا سجائی گئی ہے۔مگر آج بھی اس گڑیا کو وہ نہیں بھول سکا ہے۔ جو گلابی جمپر اور غرارہ پہنے کرن لگا دوپٹہ گلے میں ڈالے اور ہاتھ میں پرس لٹکائے ہوئے تھی۔ وہ بہت خوبصورت گڑیا تھی۔

❁ ❁ ❁

بُرے آدمی کی اچھّی نصیحت

وہ ایک معمّر سیاسی آدمی تھے۔ سرکاری دفتروں میں چھوٹے موٹے عوامی کام کرا کر اپنی ضرورتوں کے لئے پیسے کما لیتے تھے۔ اُردو کا ایک ہفت روزہ مقامی اخبار بھی افسران کو بلیک میل کرنے کے مقصد سے نکالتے تھے۔ ہر وقت نشے میں رہتے۔ چوری چھپے دیسی شراب کے اڈّے سے جب وہ دُھت ہو کر نکلتے تو پھر ڈگمگاتے قدموں کو اپنی پرانی سائیکل کے سہارے سے درست رکھتے۔ وہ سائیکل پر سوار کم ہی ہوتے تھے اُسے چھڑی یا بیساکھی کے طور پر عموماً استعمال کرتے تھے۔ نشے اور رشوت و کمیشن کی لت کے علاوہ کئی اور برائیاں بھی ان کی ذات سے منسوب تھیں۔

میں اُس زمانے میں ہائر سیکنڈری اسکول کا طالب علم تھا اور اپنے ایک نئے نئے دوست کے گھر پر آیا تھا۔ میں جیسے ہی اس کے مکان سے سائیکل لے کر باہر نکلا، موصوف نے مجھے روک لیا۔

''کس کے بیٹے ہو؟''

میں نے والد کا نام اور پتہ بتایا۔ میں اُن کے اس طرح روکنے سے کچھ خوفزدہ تھا۔

انھوں نے اپنا منہ میرے قریب لا کر دھیمے لہجے میں کہا: تم ایک شریف آدمی کے شریف لڑکے ہو۔ تمہارا یہاں آنا مناسب نہیں ہے..... کیا سمجھے؟ سمجھے یا نہیں سمجھے۔''

ان کے منہ سے نکلتے ہوئے شراب کے بھبکے سے میرا اندرون بھی متعفن ہوگیا۔سانس لینادشوار ہورہی تھی۔

اس سے قبل کہ میں کہتا جی بہت اچھا.....انھوں نے پھر کہا:"بیٹا! ایک بُرے آدمی کی تمہارے لئے یہ ایک اچھی نصیحت ہے۔"

میں نے اُن کی بات گرہ میں باندھ لی۔کبھی اُس نئے دوست کے گھر پر نہیں گیا۔وہ بھی میری سرد مہری سے مایوس ہوگیا.....بعد میں اس کے گھر سے متعلق جو واقعات میرے سننے میں آئے ان کے پیشِ نظر ایک بُرے آدمی کی مخلصانہ نصیحت نہ صرف یہ کہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکا بلکہ اُن کا ہمیشہ ممنونِ کرم رہا۔

❁ ❁ ❁

خربوزے کو دیکھ کر۔۔۔!

دہرہ دون میں شہر سے چند کلومیٹر کی دوری پر پہاڑوں کے درمیان میں ایک جھیل ہے کچھ ایسی ہی جیسی نینی تال میں ہے۔ یہاں چاروں طرف کی پہاڑیوں سے متعدد جھرنے بہتے ہوئے اس جھیل میں گرتے ہیں۔ مسوری آنے والے سیاح عموماً اس کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اس مقام کو ''سہسر دھارا'' کہتے ہیں۔ یہ اترانچل بالخصوص مسوری اور دہرہ دون کے معروف پکنک مقامات میں سے ایک ہے۔ جھیل میں بیشمار سیاح تیرتے، نہاتے اور کھیلتے رہتے ہیں۔ مرد و خواتین سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ انجوائے.....انجوائے اور انجوائے۔ یہاں ''ایک حمام ہیں.....'' والی مثل صادق ہوتی ہے لیکن پھر بھی کچھ شرمیلے یا ڈرپوک مرد اور عورتیں صرف قابلِ دید مناظر سے لطف اندوز ہونے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہاں ایک جھرنا گندھک کے پانی کا بھی ہے جو پائپ کے ذریعہ مخصوص جگہ گرایا جاتا ہے جس کے نیچے جلدی امراض سے متاثر افراد نہاتے ہیں۔

سہسر دھارا پر سیاحوں کی اس قدر بھیڑ رہتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اتوار کو تو وہاں کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے اس میں نہاتے ہیں اور تیرتے رہتے ہیں۔ نہانے والوں میں عموماً برادرانِ وطن ہوتے ہیں۔ دیگر سیاحت کے مقصد سے آتے ہیں اور کچھ دیر تماشا دیکھ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

میں نے وہاں صرف ایک ایسے معمر شخص کو دیکھا جن کے چہرے پر داڑھی تھی۔ وہ اپنے پاس بریف کیس اور کچھ کپڑے لیے بیٹھے تھے۔

میں نے انہیں سلام کیا اور پوچھا ''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

غالباً وہ بہت غصے میں تھے میرے سلام کا جواب تو دے دیا پھر بولے" وہی کرر ہا ہوں جو قسمت میں لکھا ہے۔"

میں کئی منٹ تک حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ بولے" بیٹا تم نے میری بات کو بُرا محسوس کیا ہوگا۔" مگر دیکھو وہ میرا بیٹا اور بہو اپنی اور میری عزت کا تماشا بنا رہے ہیں۔ جب سب دیکھ رہے ہیں تو تم بھی دیکھ لو۔

میں نے کہا" چچا آپ نے اجازت کیوں دی۔ اور بہت سے مسلمان بھی یہاں آتے ہیں مگر وہ تو نہیں نہاتے۔"

" مجھ سے وہ اجازت لیں گے۔ دیکھو نا چوکیداری کرر ہا ہوں ان کے سامان کی۔ یہی وہ بہو ہے جس نے میرے سامنے کبھی سر سے دوپٹہ تک نہیں اُتارا تھا۔"

چچا تھے تو غصے میں مگر ذرا سا سرک کر میرے لیے چادر پر جگہ کی اور بولے بیٹھ جاؤ۔ میں نے پھر انہیں کریدا۔" آپ کیوں آگئے ان کے ساتھ؟"

" میں آیا یا یہ لائے ہیں؟ کہنے لگے ابا یہاں جے پور میں بہت گرمی ہے۔ چلو مسوری ہو آئیں۔" چچا بتانے لگے" میں نے لاکھ منع کیا مگر پھر آ گیا باتوں میں۔ مسوری میں بھی یہی رنگ ڈھنگ رہے۔ میں تو بس ہوٹل میں پڑا سامان رکھا تا رہتا تھا یہ دونوں صبح کو نکلتے تھے تو شام کی خبر لیتے تھے۔"

" مگر چچا آپ کے بہو بیٹے نے اس طرح نہانے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟ یہ تو....."

انہوں نے میری بات کاٹ کر پھر نہایت ترشی سے کہا" مستی میں ہیں دونوں۔ اصل میں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔"

" آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں چچا۔ کچھ انگریزوں کی نقالی نے ہمیں بگاڑا اور رہی کسی کسر برادرانِ وطن کی بے حیائی نے پوری کر دی۔"

میرے اتنا کہنے پر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" سچ کہہ رہے ہو بیٹے۔" .....میں نے اُن سے اجازت لی اور رخصت ہوا۔ ✿ ✿

تضاد.....قول وعمل کا

عبدالرحمن صاحب کا شمار شہر کی باوقار شخصیات میں ہوتا ہے.....سنجیدہ، بردبار، وضع دار اور صاحبِ رائے تصور کیے جاتے ہیں۔

ہماری ہی گلی میں ان کا مکان ہے..... پرانے انداز کا وسیع وکشادہ مکان۔

اہلِ محلہ ان کی عزت کرتے ہیں۔ وہ بھی سب سے برابری کی سطح پر ملتے ہیں۔ ان کی نصیحتیں بھی کسی پر گراں نہیں گزرتیں کیوں کہ ان کے مخلصانہ جذبوں کے سبھی معترف ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے.....

میں اپنی اہلیہ کے ساتھ بازار کے ایک کلاتھ اسٹور سے نکل رہا تھا اور وہ اندر داخل ہو رہے تھے۔ سلام علیک کے بعد بولے۔ ''اچھا بھابھی بھی ساتھ ہیں۔''

''جی، بھائی صاحب! سوچا پھر رمضان آجائیں گے تو نہ وقت ہوگا اور نہ ہی گرمی میں باہر نکلنے کی ہمت..... اس لئے بچوں کے لئے کپڑے خرید لئے جائیں۔'' میری اہلیہ نے وضاحت کی..... بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک دن عبدالرحمن صاحبان نے عصر کی نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے سرگوشی کی۔

''بھئی نثار صاحب! ہمیں کئی دنوں سے ایک بات کھٹک رہی ہے۔ سوچا آج کہہ ہی دیں۔''

''جی فرمائیے۔'' میں نے اُن کے مزید قریب ہوتے ہوئے کہا۔

''بھائی آپ اُس دن بازار میں تھے۔ بھابھی آپ کے ساتھ بے پردہ تھیں۔ ہمیں کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا۔ وعظ و نصیحت اور شریعت کے تعلق سے گفتگو تو علماء کر سکتے ہیں مگر ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ بھابھی کا اس طرح گھر سے نکلنا ہمیں مناسب نہیں لگا۔''

میں نے عبدالرحمن صاحب کے احساسات جب اہلیہ کے سامنے پیش کیے تو تھوڑے سے پس و پیش کے بعد انھوں نے بات مان لی۔ اسی دن سے انھوں نے برقع پہن لیا۔

آج اہلیہ کی جانب سے ایک نیا مطالبہ سامنے آیا۔

میرے دفتر سے آنے کے بعد جب سہ پہر کی چائے پر اہلیہ نے اطلاع دی..... ''آج عبدالرحمن صاحب مع فیملی کے نینی تال گئے ہیں۔''

''آپ کو کیسے معلوم کہ وہ نینی تال ہی گئے ہیں۔؟''

''جب یہ لوگ اپنے مکان سے نکل کر باہر آئے تو میں دروازے پر تھی۔ چھوٹی لڑکی نے نقاب ہٹا کر مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا خیریت تو ہے؟ کہاں کا ارادہ ہے تو لڑکی نے بتایا .....نینی تال جا رہے ہیں۔ پھر وہ خاموش ہوگئیں۔ چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگیں.....''کل اتوار ہے۔ ایسا کریں کہ ایک دن کے لئے ہم دونوں بھی گھوم آئیں۔ قیام نہیں کریں گے۔ بس شام کو واپس لوٹ آئیں گے.....''

اہلیہ نے کچھ اس طرح کہا کہ میں منع نہیں کر سکا اور اگلی صبح فجر کی نماز پڑھ کر بس پکڑی اور دس بجے نینی تال پہنچ گئے۔ تلّی تال سے ملّی تال کے لئے ہم دونوں پیدل ہی مال روڈ پر چلنے لگے۔ ابھی کوئی سو قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ سامنے سے عبدالرحمن صاحب مع فیملی آتے نظر آئے..... میں نے قریب پہنچ کر السلام علیکم کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا.....

عبدالرحمن صاحب ہکا بکا رہ گئے.....''ارے آپ؟ آپ..... آپ کیسے آ گئے؟۔''

''جیسے کل آپ آ گئے تھے..... آپ اپنی کار سے پہنچے اور ہم آج بس سے۔''

عبدالرحمن صاحب کی حالت اُس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ ان کی بیگم اور دونوں بیٹیاں بے پردہ تھیں اور میری اہلیہ برقع پہنے تھیں۔

عبدالرحمن صاحب بار بار کچھ کہنا چاہتے تھے مگر جو کچھ کہنا چاہتے تھے الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ''بھائی نثار صاحب! یہاں کی صورتِ حال..... میرا مطلب ہے..... یہاں جو لوگ آتے ہیں.....وہ.....وہ۔'' میں نے ان کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا.....

''اچھا اللہ حافظ ..... باتیں پھر کبھی ہو جائیں گی۔ یہاں سیر کا لطف اُٹھائیں۔'' ہم دونوں آگے بڑھ گئے اور عبدالرحمن صاحب پر کیا گذری، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

❁ ❁ ❁

ٹی وی سیریل

دھواں دھار بحث چل رہی تھی۔

ایک طرف ان کی دونوں بیٹیاں تھیں تو دوسری طرف خود محترم نصیرالدین صاحب

بحث ایک خاص ٹی وی سیریل سے متعلق تھی جس کے بارے میں نصیرالدین صاحب کا احساس تھا کہ اس کا نہ صرف ذہنوں پر منفی اثر پڑے گا بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اسے دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ مسلم گھرانوں میں یہ بگاڑ کا موجب ہوسکتا ہے۔

موصوف کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹیاں ان کے اس احساس کے رد میں دلائل دے رہی تھیں خاص طور پر چھوٹی بیٹی اپنے دلائل جس طرح پیش کر رہی تھی اُن کی کاٹ نصیرالدین صاحب کے لئے دُشوار ہو رہی تھی.....وہ اپنی عمر اور تجربے کا بار بار حوالہ دیتے۔ اپنی ذمہ داری اور اولاد کی تربیت کے تعلق سے اپنا اعتماد بحال کرنے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کرتے.....مگر بے سود۔

بحث اگرچہ دلچسپ تھی۔ میں جتنی دیر رہا مسکراتا رہا۔ اس قضیہ میں اپنی ٹانگ اُڑا کر خود کو کسی آزمائش میں ڈالنا مجھے مناسب نہیں لگا اور دورانِ بحث چلا آیا..... مجھے نہیں معلوم ہوسکا کون فاتح قرار پایا اور شکست کس کو ملی۔

آج پندرہ دن بعد اتفاق سے میں پھر نصیرالدین صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا۔ وہ میرے نہایت قریبی عزیز ہیں۔ سوئے اتفاق وہی سیریل چل رہا تھا جس پر گذشتہ دنوں بحث چل رہی تھی..... میرے لئے حیران کن بات یہ تھی کہ آج وہی سیریل نصیرالدین صاحب بھی دیکھ رہے تھے.....

❁ ❁

فاقہ زدہ

اجمیر میں ایک بھکاری نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا" بابا مجھے کھانا کھلا دے۔ دو وقت سے بھوکا ہوں۔"

پہلے تو میں نے اُس کی التجا سُنی اَن سُنی کر دی لیکن جب وہ ایک پیر سے لنگ کرتا ہوا میرے پیچھے پیچھے آیا تو مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے اُسے پیشہ ور بھکاری نہ سمجھتے ہوئے کچھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ پھر گڑ گڑایا....." بابا اللہ کے نام پر دے.....دو وقت سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

میں نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ کوئی دو یا پانچ روپے کا نوٹ نہیں تھا۔؛ میں نے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر کہا۔" لے لو! اس میں سے پانچ روپے اور کھانا کھا لو۔ باقی مجھے دو۔"

وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا" اگر نہیں ہیں تو آؤ میں کھانا کھلا دوں۔"

یہ سُن کر اُس نے نوٹ جیب میں رکھا اور قمیص کے نیچے پہنے ہوئے بنیان کی جیب سے بہت سے نوٹ نکال کر پینتالیس روپے گن کر مجھے دے دیئے۔

میں ہکا بکا رہ گیا کہ یہ دو وقت کے تو فاقے سے ہے اور اتنے بہت سے روپے اِس کی جیب میں ہیں۔

❁ ❁ ❁

اُردونوازی

کچھ دیر پہلے میں آج کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔

ڈاک میں ایک لفافہ غیر معمولی وزنی تھا۔ میں نے اسے چاک کیا۔ لفافہ میں دو پوسٹر اور ایک خط تھا۔ دونوں کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی تھا، البتہ خط میں اتنا اضافہ تھا کہ ان پوسٹروں کو اپنے شہر میں کسی نمایاں جگہ چسپاں کرادیں۔ یہ لفافہ انجمن عاشقانِ اردو کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔

پوسٹر میں حکومت سے مطالبات کے علاوہ اردو داں حضرت کے لیے بھی یہ درخواست کی گئی تھی کہ:-

- اُردو کی ترقی کے لیے اُردو اخبارات اور رسائل زیادہ سے زیادہ خرید کر پڑھیے۔
- سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں درخواستیں اُردو میں دیجیے۔
- اپنے بچّوں کو اُردو پڑھوایئے۔
- اپنی مادری زبان اُردو لکھوایئے۔
- ڈاک خانے سے متعلق فارم اُردو میں پُر کیجیے۔ خطوط اور لفافوں پر پتہ اُردو میں لکھیے۔

اچانک میری نظر لفافہ پر پڑی۔

میرا پتہ انگریزی میں لکھا گیا تھا!!

❁ ❁ ❁

مرتضیٰ ساحل تسلیمی تعمیری واصلاحی ادب
کے ایک معتبر نمائندہ ادیب وشاعر ہیں۔ مجھے
خوشی ہے کہ وہ بچّوں کے ادب کے ساتھ ساتھ
بڑوں، بالخصوص خواتین کے لئے بھی لکھتے ہیں۔
وہ ایک مشاق قلمکار ہیں اور جو کچھ بھی لکھتے ہیں
اصلاحِ معاشرہ پیشِ نظر رہتا ہے۔ مرتضیٰ ساحل
تسلیمی کے افسانے محض افسانے نہیں ہیں بلکہ
صالح معاشرہ کی تعمیر میں ان کی کوششوں کا ایک
حصّہ ہیں۔ وہ حسن وعشق کی بے راہ روی اور
آزادانہ اختلاطِ مردوزن سے بچ کر سماج کے دیگر
مسائل پر افسانے تخلیق کرتے ہیں۔
عبدالملک سلیم
مدیر اعلیٰ ماہنامہ (الحسنات، بتول، نور، ہلال وبادی ہندی)
ادارہ الحسنات۔ رامپور

محترم مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے یوں تو خود کو ادبِ اطفال کی
تخلیق کے لئے وقف کر رکھا ہے لیکن ادارتی ضرورتوں اور کبھی کبھی
مزہ منھ کا بدلنے کے مصداق افسانے، انشائیے اور مضامین بھی
لکھتے ہیں..... اور جو کچھ لکھتے ہیں وہ با مقصد ہوتا ہے۔ ان کے
افسانوں میں بھی قاری کو اپنی کردار سازی اور اپنے مسائل کے
حل کرنے کے لئے مواد مل جاتا ہے۔ اپنے مشاہدے کو اپنی
صالح فکر کی روشنی میں قرطاس پر افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔ وہ ایک
ہمہ جہت قلم کار ہیں اور جو کچھ بھی لکھتے ہیں وہ خوب اور بہت
خوب ہوتا ہے..... خواہ وہ ادبِ اطفال ہو، طنز و مزاح ہو، اداریہ
ہو یا افسانہ۔
عبدالباری وسیم
مدیر ماہنامہ ہلال، رامپور

(افسانوی مجموعہ)

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

ناشر

نور پبلی کیشنز

2842، کوچہ چیلان، دریاگنج، دہلی

AAKHRI TAAQUB

by

Murtaza Sahil Tasleemi

Published by :
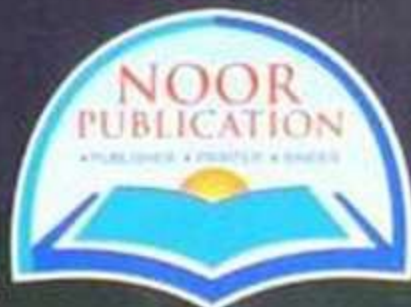
2842, Kucha Chellan, Darya Ganj, New Delhi-2